بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن کہتا ہے کہ ہر مقام اور ہر زمانے میں یہی ہوا کہ جس قوم نے آنکھیں بند کر کے اسلاف کی روش پر چلتے رہنے پر اصرار کیا اور اپنی عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیا وہ بالآخر تباہ ہوگئی۔ اور جس نے خدا کی راہنمائی کی روشنی میں عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا وہ شاہراہِ ترقی پر آگے بڑھتی چلی گئی' جب اس نے اس روش کو چھوڑ دیا تو یہ بھی اسی مقام پر رک کر کھڑی ہوگئی۔ رک کر کھڑی ہونے والی قوم زندگی کے ہر شعبے میں رک کر کھڑی رہتی ہے اس لئے اس کا یہ جمود و تعطل مادی مصنوعات سے آگے بڑھ کر فکری اور قلبی صلاحیتوں کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔ اس سے یہ قوم شرفِ انسانیت سے بھی محروم ہو جاتی ہے اور یوں اس کی دنیا اور عاقبت دونوں تباہ ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے نوعِ انسان کی راہنمائی کے لئے ایک ضابطۂ حیات دیا جس کے اصول غیر متبدل اور جس کی اقدار مستقل تھیں۔ اس نے انسانوں کو دعوت دی کہ تم علم و بصیرت سے اس پر غور کرو اور جب تم مطمئن ہو جاؤ کہ یہ تمہاری فلاح و بہبود کے ضامن ہو سکتے ہیں تو بطیب خاطر انہیں اختیار کرو۔ پھر ان کی روشنی میں' اپنی عقل و فکر سے کام لیتے ہوئے' اپنے مسائل کا حل دریافت کرو اور یوں شاہراہِ حیات پر آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ اسلام گویا اس ذہنیت کے خلاف انقلابی آواز تھا جس کی رو سے کہا یہ جاتا تھا کہ ہم نے فلاں راستے کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ ہمارے اسلاف اسی راستے پر چلتے آئے ہیں۔ اس نے انسانوں سے برملا کہہ دیا کہ اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینا اور جس راستے پر آگے جانے والے چلے آ رہے ہیں' آنکھیں بند کئے اسی راستے پر چلتے جانا' انسانی روش نہیں' حیوانات کی روش ہے جنہیں عقل و فکر دی ہی نہیں گئی۔ تم جو کچھ بھی کرو' اس کے لئے تمہیں خود معلوم ہونا چاہئے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تم اپنے ہر فیصلہ کے لئے خود ذمہ دار اور مسئول ہو۔ کسی اور کا فیصلہ نہ تمہارے لئے سند ہو سکتا ہے' نہ اس کے نتائج سے تمہیں بری الذمہ قرار دے سکتا ہے۔ اصولی طور پر' تمہارے ہر فیصلہ کی سند اللہ کی کتاب ہے' اور تمہارے ہر عمل کی علت (کیوں؟) کا جواب تمہاری عقل و فکر کے ذمہ ہے۔ یعنی اگر تم سے پوچھا جائے کہ تم نے فلاں معاملہ میں یہ اصول کیوں اختیار کیا تو اس کے لئے تمہارے پاس خدا کی کتاب کی سند ہونی چاہئے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ اس اصولی فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لئے تم نے فلاں طریق کیوں اختیار کیا تو اس کے لئے تمہیں عقلی دلائل دینے ہوں گے۔ یہ جواب کہ میں یہ کام اس لئے کرتا ہوں کہ میرے آباؤ اجداد اسی طرح کرتے تھے' کوئی جواب نہیں۔

غور کیجئے کہ قوموں کے زوال اور انحطاط کے متعلق جس بنیادی علت (Cause) تک عصرِ حاضر کے مفکرین اور محققین مدت العمر کی کاوش و کاہش کے بعد پہنچے ہیں' قرآن کریم نے اسے اتنا عرصہ پہلے کس طرح واشگاف انداز میں بیان کر دیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے اس اصول پر عمل کیا تو وہ دنیا کی ہر ''مذہب پرست'' قوم پر غالب آ گئے اور شاہراہ حیات میں' اپنے زمانے سے کہیں آگے نکل گئے۔ ''مذہب پرست'' طبقہ سے مراد تمام وہ اقوام ہیں جو ''اسلاف کی روش'' کو اپنے لئے سند تسلیم کرتی تھیں اور ان سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنے کے تصور سے کانپ اٹھتی تھیں۔ یہ قومیں' مسلمانوں کے مقابلہ میں جہاں بھی آئیں' انہوں نے بری طرح شکست کھائی۔ ان کا شکست کھا جانا' قضائے جرم تھا۔ اس اٹل اصول کے مطابق تھا جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے پاس نہ اصولی طور پر خدا کی سند تھی نہ ہی اپنے پروگرام کے لئے عقل وفکر کی دلیل۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عرصہ کے فکری تعطل سے ان کی غور و تدبر کی صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی تھیں۔ یہ قومیں بھلا اس قوم کے سامنے کس طرح ٹھہر سکتی تھیں جس کے پاس راہنمائی کے لئے خدا کے ابدی حقائق ہوں اور جو اپنا ہر قدم' سمجھ سوچ کر اٹھائے اور اسے معلوم ہو کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟

اس دور کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا' وہ آج ہر محراب و منبر سے بلند ہونے والی آوازوں سے ظاہر ہے۔ آپ ''علمائے کرام'' سے دین کے متعلق کوئی بات پوچھئے۔ جو کچھ وہ جواب میں کہیں اس کے متعلق اتنا دریافت کر لیجئے کہ اس کی سند کیا ہے؟ اس کا جواب آپ کو اس کے سوا کچھ نہیں ملے گا کہ ہمارے اسلاف کا یہی مسلک ہے۔ بزرگوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ فلاں امام نے یہ کہا ہے۔ فلاں مفسر کا یہ ارشاد ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ یعنی ماوجدنا علیه اٰباء نا'' کی وہی ذہنیت جس کے خلاف حضرات انبیاء کرامؑ برابر جہاد کرتے رہے اور جس کے خلاف آخرالامر قرآن ایک انقلابی صدائے احتجاج بن کر آیا۔ یہی ذہنیت ہماری روش زندگی کی بنیاد بن گئی ہے اور اس طرح خدا کا دیا ہوا دین' اسی مذہبی سطح پر آ گیا ہے جو اقوام سابقہ کا مسلک تھا اور جن کی تباہی اور بربادی کی داستانیں قرآن نے اس مقصد کے لئے بیان کی تھیں کہ قرآن کو ماننے والی قوم ان سے عبرت حاصل کرے۔ آپ سوچئے کہ اس قدر واضح حقیقت کے بعد' کیا اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کر کے یہ دریافت کریں کہ ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی تصور کر سکتے ہیں کہ جس ذہنیت اور مسلک کا نتیجہ' اقوام سابقہ کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہوا تھا' وہی ذہنیت اور مسلک ہمارے لئے عزت اور عروج کا موجب بن جائیں گے؟ یہ تو سنتہ اللہ کے خلاف ہے۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کا جو نتیجہ اقوام سابقہ کے حق میں برآمد ہوا تھا بعینہٖ وہی نتیجہ ہمارے لئے مرتب ہوگا۔ ''مرتب ہوگا'' کیا؟ وہ تو مرتب ہو کر ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ صدیوں سے ہم جس ذلت اور پستی کے عذاب میں گرفتار ہیں وہ خود اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے جو کچھ اقوامِ کہن کے ساتھ ہوا وہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویز مرحوم

بنیادی حقوقِ انسانیت قرآن کی روشنی میں

قرآن کی رو سے دنیا کے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی حیثیت سے کچھ بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ یہ حقوق کسی معاہدہ یا میثاق سے مشروط نہیں ہیں۔ نہ کسی خدمت کا معاوضہ۔ یہ بلا مشروط ہوں گے اور بلا مزد و معاوضہ ہر انسان کو۔۔۔ بلاتخصیص مذہب، ملت، زبان، رنگ، نسل، وطن، محض انسان ہونے کی جہت سے حاصل ہوں گے۔ دیکھئے یہ حقوق کیا ہیں، جنہیں ہر انسان قرآنی معاشرہ سے، طلب کر سکتا ہے۔

(۱)　احترامِ آدمیت

پہلا حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ ولقد کرمنا بنی اٰدم...... (۱۷/۷۰) قرآن کا ارشاد ہے۔ یعنی ''ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے''۔ لہٰذا، پیدائش (حسب، نسب، ذات، برادری وغیرہ) کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق۔ امارت اور غربت کے لحاظ سے انسانوں میں تمیز۔ کسب و ہنر اور پیشوں کے اعتبار سے انسانوں میں تفرق اس پیدائشی حق کے خلاف ہے۔ مختصر الفاظ میں، انسان کی تذلیل، خواہ کسی جہت سے ہو، اس حق کی خلاف ورزی ہے۔ ''آدمیت، احترامِ آدمی'' قرآن کا پہلا اصول ہے اور ہر انسان کا اولیں بنیادی حق، بلامشروط۔

(۲)　جنسی مساوات

قرآنِ کریم کی رُو سے، جنسی تفریق نہ وجہٗ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہیں اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر، مردوں سے کمتر۔ زندگی کی ابتدا، نفس واحدہ سے ہوئی ہے خلقکم من نفس واحدۃ...... (4/1)۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسانی بچہ میں۔۔۔ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔۔۔ کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا۔۔۔ انا خلقکم من ذکر و انثیٰ...... (49/13)۔ اس لئے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں، نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوع انسان کے افراد ہیں اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے، اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رکھیں جائیں اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر .... (Biologically) مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبعی وظائف حیات سے ہے۔ انسانیت

کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے اور اعمال کے نتائج بھی یکساں' لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ بعضکم من بعض ...... (3/194)۔تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ضائع نہیں ہوسکتا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔۔۔ مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا؟ تم ایک دوسرے کے اجزا ہو۔ تم خلقت کے اعتبار سے ایک ہو۔۔۔ زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر آیات (33/35)' (9/71) میں دیکھئے۔ قرآن کریم کس طرح مردوں اور عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں دوش بدوش گامزن بناتا ہے۔

لہٰذا' جنسی مساوات' انسانیت کا بنیادی حق ہے جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جاسکتا۔قرآنی معاشرہ اس حق کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

(۳) مدارج علیٰ قدرِ اعمال

احترامِ آدمیت کے بعد' معاشرہ میں مختلف افراد کے مدارج کا سوال سامنے آتا ہے اس کے لئے اصول یہ ہے کہ ولکل درجٰت مما عملوا...... (46/19)۔ ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ' اس کے اعمال و کردار کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ یعنی سب سے پہلے ہر انسان کی عزت بحیثیت انسان ہوگی' اور اس کے بعد اس کے جوہر ذاتی اور حسن سیرت و کردار کو دیکھا جائے گا' اور ان کے مطابق سوسائٹی میں اس کا مقام اور درجہ مقرر کیا جائے گا۔ جو جتنی زیادہ خوبیوں کا مالک وہ اتنے ہی اونچے مقام کا مستحق۔حتیٰ کہ ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم ...... (49/13)۔ جو سب سے زیادہ حسن عمل کا پیکر' وہ سب سے زیادہ واجب العزت۔ نیچے سے لے کر اوپر تک' عزت کا ہر مقام ہر شخص کے لئے کھلا ہوگا' جسے وہ' اپنی قابلیت اور حسن سیرت کی رو سے بطور حق حاصل کر سکے گا۔ اسکا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا' نہ ہی تعین مدارج کا کوئی اور معیار مقرر کیا جاسکتا ہے۔

(۴) حقِ آزادی

''آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے''۔ یہ نعرہ اور اعلان تو آپ نے ہر جگہ سے بلند ہوتا سنا ہوگا لیکن اس کا صحیح مفہوم بہت کم سامنے آیا ہوگا۔ جس جگہ سے آپ نے یہ نعرہ بلند ہوتے دیکھا ہوگا' وہیں سے آپ نے آئے دن ایسے احکام نافذ ہوتے بھی دیکھے ہوں گے جو ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔ لہٰذا' یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر آزادی' انسان کا پیدائشی حق ہے' تو پھر اس پر یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رو سے عائد کی جاتی ہیں اور قانون کی رو سے عائد کردہ پابندیاں' انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ اگر پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔۔۔ لہٰذا صحیح آزادی کے لئے قانونی پابندیاں لاینفک ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لئے قانونی پابندیاں ضروری ہیں' لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ ارباب اقتدار' جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے' جس قدر

ظلم اور زیادتی' قانون کے پردے میں کر سکتے ہیں' لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا' اور اس دور دستور و آئین میں یہ' قانون کے پردے میں ہوتا ہے۔ صاحب اقتدار طبقہ نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے پہلے وہ' قانون سازی کی رسم ادا کر لیتا ہے' اور پھر یہ' شاہ مدار کی بسم اللہ پڑھ کر پھونکی ہوئی چھری' جس جانور کے گلے پر پھیر دی جائے وہ ذبیحہ حلال قرار پا جاتا ہے۔ 1 یہ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے جس کا دنیا کو آج تک خاطر خواہ حل نہیں مل سکا کہ انسانی آزادی اور قانونی پابندی میں ایسی مفاہمت کی صورت کس طرح پیدا کی جائے کہ قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ پر قائم رہیں اور افراد کے حقوق بھی پامال نہ ہوں۔ اس کا حل قرآن نے بتایا۔ اس نے اس ضمن میں' پہلے یہ واضح کر دیا کہ

> ما کان لبشر ان یؤتیه الله الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون الله .... (3/78)۔

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو' کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں۔

قرآن کے اس اعلانِ عظیم نے انسانی آزادی کا ایسا بلند منشور عطا کر دیا جس کا تصور بھی ذہنِ انسانی نہیں کر سکتا تھا۔ 2 یہ تو رہی کامل آزادی کی شکل۔ اب قانونی پابندی کو دیکھئے۔ اس کے لئے اسی آیت میں پہلے من دون الله کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ افراد کی آزادی پر پابندیاں لگانا تو ضروری ہیں لیکن یہ پابندیاں کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ اس کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے یہ پابندیاں کس طرح لگائی جائیں گی؟ کیا یہ وہی تھیا کریسی ہوگی جس میں مذہبی پیشوائیت' خدا کے نام کی آڑ میں' ہر قسم کی من مانی کرتی ہے؟ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ تھیا کریسی تو استبداد کی بدترین شکل ہے' اسی لئے اس نے فرعون کے ساتھ ہامانؔ کو بھی برابر کا مجرم قرار دیا ہے جو مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ تھا۔ قانونی پابندیوں کے لئے اس نے کہا کہ

> ولٰکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتٰب و بما کنتم تدرسون o (3/78)۔

خدا نے ان حدود اور پابندیوں کو' جو انسانی آزادی پر عائد کی جائیں گی' اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا کہ ان پابندیوں میں کسی قسم کی کمی بیشی کر سکے یا ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد کرے۔ لا الٰہ الا اللہ کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا محکوم اور تابع فرمان (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اب رہا یہ کہ کتاب اللہ میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی صورت کس طرح متعین کی جائے۔ اور اس کے لئے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ حق بھی کسی

(1 یوپی کے عام دیہات میں یہ رواج تھا۔۔ شاید اب بھی ہو۔۔ کہ گاؤں کا جاہل ملا' جسے ذبح کے وقت تکبیر تک پڑھنی نہیں آتی تھی' ایک چھری شاہ مدار کی خانقاہ لے جاتا۔ وہاں کا مجاور' بسم اللہ پڑھ کر چھری پر پھونک دیتا۔ اس چھری سے جو جانور ذبح کیا جاتا اسے حلال سمجھ لیا جاتا۔ سال کے بعد پھر چھری کی تجدید کرا لی جاتی۔)

(2 ظاہر ہے کہ جو قرآن ایک انسان کو دوسرے...... انسان کا محکوم بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتا' وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنانے کی اجازت کب دے گا؟ قرآن نے غلامی کو ختم کر دیا تھا۔ اس کی وضاحت ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ۔۔۔ غلام اور لونڈیاں۔۔۔ میں ملے گی۔)

خاص گروہ اور جماعت کونہیں دیا گیا' بلکہ یہ تمام افراد معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ اموران کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔۔۔وامرھم شوریٰ بینھم...... (42/38)۔ یہ حقِ مشاورت بھی' بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہے' جس میں مرد اور عورت' امیر اور غریب' سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری' اپنے اپنے حالات کے مطابق' خود مرتب کی جاسکتی ہے۔

لہٰذا' قرآنِ کریم نے' یا تو وہ قوانین دے دیئے ہیں جن کی پابندی کرائی جائے گی اور یا وہ حدود متعین کردی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے افراد معاشرہ' باہمی مشاورت سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتب کرسکیں گے۔ اس حدود سے تجاوز کرنے' یا ان کے علاوہ' اور حدود وقیود متعین کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا' کیونکہ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہوگا جس کی اجازت کسی انسان کونہیں دی جاسکتی۔ اسے وہ شرک قرار دیتا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے: ام لھم شرکٰؤا شرعوالھم من الدین مالم یاذن به الله...... (42/21)۔ کیا ان کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لئے دینِ خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی؟ لہٰذا' انسانی معاشرہ کے لئے کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جاسکتا جس کی اجازت قرآنِ کریم نے نہ دی ہو۔

یہ ہے وہ طریق جس سے' قرآنِ کریم' انسانی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دیتا' اور معاشرہ میں لاقانونیت بھی نہیں پھیلنے پاتی۔ یہ قرآن کے منشورِ حقوقِ انسانیت کی منفرد خصوصیت ہے۔

(۵) حقِ محنت

قرآن کا ارشاد ہے کہ ووفیت کل نفس ما عملت...... (39/70)۔ ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا' نہ اس میں کمی۔ اسی سلسلہ میں اس نے' دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ لیس للانسان الا ماسعیٰ...... (53/39)۔ بجز ان لوگوں کے جو کام کرنے سے معذور ہوں (جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)' کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر' کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ یعنی اس معاشرہ میں' ایسے خون آشام طبقہ (Parasites) کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کو سلب (Exploit) نہیں کر سکے گا' تو ہر کام کرنے والا' اپنی محنت کے پورے ماحصل کا حقدار ہوگا۔ اس اصول کی رو سے نظام سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جس کا وجود ہی دوسروں کی محنت کے ماحصل کو غصب کرنے پر ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! جو کام کرنے کے قابل ہونے کے باوجود دوسروں کی محنت کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا ہے' وہ گداگر ہے' خواہ کتنا ہی بڑا دولت مند کیوں نہ ہو۔

(۶) عدل واحسان

اس کا نام عدل ہے۔ یعنی ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ قرآن کی رُو سے عدؔل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے۔ جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفظ شامل ہے۔ جسے قانونی عدل

کہتے ہیں' اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق غصب ہوتا ہو' تو عدالت کی مشینری اسے وہ حق دلا دے۔ عدل کے معاملہ میں' قرآن اتنا محتاط اور جُزرَس ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا! اس باب میں دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرنے لگ جانا۔ لا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی طرف سے دشمنی کا برتاؤ تمہیں اس پر آمادہ کردے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اعدلوا۔ وہ کچھ بھی کریں' تم ان کے ساتھ ہمیشہ عدل کرو۔ اس لئے کہ یہ ادلے بدلے کی بات نہیں۔ یہ' انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا حق' اور اس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔ ھو اقرب للتقویٰ...... (5/8)۔

قانونی عدل سے مراد ہے۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین و حدود کے مطابق' نزاعی امور کا فیصلہ کرنا۔ جب قرآنِ کریم نے حقِ حکومت کسی انسان کو نہیں دیا' تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس نے قانون سازی کا حق کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو نہیں دیا۔ عدل' قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کا نام ہو گا۔ اگر مملکت کا کوئی قانون' قرآنی ضابطہ کے خلاف ہو گا تو مملکت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہو گا کہ اسے بدلوائے اور مملکت کا فریضہ ہو گا کہ اسے تبدیل کرے۔

لیکن' قرآن' عدل تک نہیں رہتا۔ اس سے بھی آگے جاتا ہے (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے) عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب (Due) ہو' وہ اسے دے دیا جائے۔ لیکن اگر اس سے کسی کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو' اس میں کمی رہ جاتی ہو' تو پھر کیا ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان...... (16/90)۔ اس صورت میں' تم اس کی کمی کو پورا کر کے' اس کے اور خود معاشرہ کے توازن کو بگڑنے سے بچا لو۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ یہ بھی بنیادی حقوق انسانیت میں شامل ہے۔ دنیا' ایسے مواقع پر خیرات کی تلقین کرتی ہے' لیکن خیرات سے جس طرح شرف انسانیت پامال ہوتا ہے' اور خیرات لینے والے کی عزتِ نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے' وہ ظاہر ہے۔ اس لئے قرآن نے احسان' کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے' وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع بطور حق طلب کر سکتا ہے۔ فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم...... (70/24)۔ وہ لوگ' جن کی محنت سے ان کی ضروریات پوری نہ ہوں یا جو محنت کرنے سے معذور ہوں' ان کا' ان لوگوں کے مال میں حق ہے جن کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ ہے اور یہ حق ڈھکا چھپا نہیں قرآنی معاشرہ میں سب کو معلوم ہے۔ افراد کی ہر قسم کی کمی پوری کرنے کو' بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کرنا قرآن کے سوا آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

(۷) رِزق کا حق

انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار' سامانِ زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے سامانِ زیست خود پیدا یا مہیا کرے۔ لیکن قرآنِ کریم اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ کہتا ہے کہ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا...... (11/6)۔ دنیا

میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامانِ زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے' قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظامِ مملکت کی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا' یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے اور وہ تمام افرادِ معاشرہ سے علانیہ کہہ دے کہ نحن نرزقکم و ایاھم...... (6/152)۔ ہم تمہاری ضروریات زندگی پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔ بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کیا جانا' ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظام معاشرہ سے ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔ یہ حق آپ کو دنیا کے کسی چارٹر میں نہیں ملے گا۔

اس کی وضاحت میری کتاب نظامِ ربوبیت میں ملے گی۔

جہاں تک اولاد کے لئے رزق مہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ ولا تقتلوا اولادکم من املاق...... (6/152)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کردو۔ تو اس میں ''قتل'' کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔ اس سے مراد علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہٰذا' قرآنی معاشرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت ہو۔ بنابریں' قرآن کی رُو سے' سب بچے' عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں' اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔

(۸) جان کی حفاظت

لیکن ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے' انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا کہ ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق...... (6/152)۔ خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں! اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے! حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں' اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا...... اگر کوئی' کسی کو ناحق قتل کر دے' تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظامِ عدل و امن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے' اور کسی طرح' اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے تو اسے بھی موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے علاوہ' اگر کوئی کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا' پوری نوعِ انسان کو تلف کر دیا ہے۔ اس کے برعکس' ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا...... (5/32)۔ جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کی جان بچالی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جن مخصوص حالات میں

قرآن کریم نے' کسی انسان کی جان لینے کی اجازت دی ہے۔ (یعنی قانون کی رُو سے سزائے موت) وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی محافظت کے لئے ہے۔ اسی کو بالحق کہا گیا ہے۔

(۹) مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق میں داخل ہے جو' قانونِ خداوندی کی رُو سے' افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ دوسروں کی ان چیزوں کو ناجائز طور پر اپنے تصرف میں لے آئے۔ اسی لئے فرمایا کہ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل ...... (4/29)۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ ''مال'' ایک جامع اصطلاح۔ جس میں ہر قسم کی مقبوضات آ جاتی ہیں اور اس کا تحفظ ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔

یہاں سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ اگر کسی کے ہاں چوری ہو جائے یا ڈاکہ پڑ جائے' تو دنیا کے مروجہ نظامِ عدل کی رُو سے' مجرم کو سزا دے دی جاتی ہے۔ لیکن جس کا مال چلا گیا تھا' اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ اگر یہ نقصان اس کی اپنی غلطی۔ تساہل یا تغافل کی وجہ سے نہیں ہوا' تو اس کی تلافی کا وہ حقدار ہوگا۔ اس اصول کا اطلاق' تا بحد امکان دیگر قسم کے نقصانات پر بھی ہوگا۔

(۱۰) سکونت کی حفاظت

جان اور مال کی حفاظت کے بعد' قرآنِ کریم' ہر فرد کو سکونت کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس نے یہودیوں کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی ہے اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم و تخرجون فریقاً منکم من دیارھم ...... (2/85)۔ تم وہ ہو' جو اپنے لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے ہو' اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ لہٰذا' افرادِ معاشرہ کو سکونت مہیا کرنا مملکت کا فریضہ ہے اور کسی کو بے گھر' بے در' بنا دینا' اس کے اس بنیادی حق کو غصب کر لینا ہے۔

(۱۱) عصمت کی حفاظت

عصمت' انسان کی بے بہا متاع ہے۔ یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے حیوانات میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جنسی اختلاط ایک طبعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔ لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم اس کی حفاظت کو مستقل حق انسانیت قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے: الزانیة و الزانی فاجلدو کل واحد منھما مائة جلدة ...... (24/2)۔ زانی مرد ہو یا عورت۔ انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرم زنا کا ارتکاب ہی نہیں۔ اس کے نزدیک' شریف عورتوں کے خلاف تہمت بے جا بھی سنگین جرم ہے۔ جس کی سزا اسّی کوڑے ہے (24/4) اس لئے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آ جاتا ہے۔

اور شریف زادیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا۔ ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلا کر لوگوں کے

جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا' اس کے نزدیک' اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اس جرم کی پاداش میں' اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ انہیں حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹ بلا ضمانت جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی فرد بھی سزا سے بچنے نہ پائے۔ وقتلوا تقتیلا ...... (33/60)۔ یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے متعلق کہا کہ سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا o (22/61)۔ یہی قانون' خدا نے اقوام سابقہ کو بھی دیا تھا اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

ان تمام حقوق کی حفاظت مملکت کا فریضہ ہے۔

(۱۲) شادی میں انتخاب کا حق

تعلقِ زوجین کے سلسلہ میں' قرآن کریم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی ہے کہ شادی میں' اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق ہے۔ اس نے مردوں سے کہا کہ فانکحوا ماطاب لکم من النساء...... (4/3)۔ تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حق انتخاب کی حفاظت کر دی کہ لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا...... (4/19)۔ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔

اس سلسلہ میں' ضمناً اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے' معاہدۂ نکاح کے بعد' خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں۔۔۔صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ طلاق (یا بیوگی) کی صورت میں' عورت کو عدت کی مدت میں نکاح ثانی کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور مرد کے لئے کوئی عدت نہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی اس دوران میں یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں۔ یہ حکم' پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لئے ہے۔ یعنی یہ متعین کرنے کے لئے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے: ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ ...... (2//228)۔ عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں۔ جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں مرد کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے اور وہ یہ کہ اسے عدت نہیں گذارنی پڑتی۔

ان حقوق کا تحفظ مملکت کا فریضہ ہے۔

(۱۳) حسنِ ذوق کا حق

قرآن' انسان کے انفرادی حسنِ ذوق (Aesthetic Taste) کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے' اس حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق ......(7/32)۔ ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے' اور خوشگوار سامانِ زیست کو' حرام قرار دے؟ حدود اللہ کے اندر

رہتے ہوئے' ان سے لطف اندوز اور کیف یاب ہونا' ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اسے کوئی محروم نہیں کرسکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا' اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کھانے پینے کے انداز اور رہنے سہنے کے طریق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حق انتخاب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنے عزیزوں' رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں سے جس کے ہاں جی چاہے کھاؤ پیؤ اور خواہ اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ' اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لیس علیکم جناح ان تاکلوا جمیعاً او اشتاتاً ...... (24/61) اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حسنِ ذوق کی رعایت رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ' زینت بھی ہے: یٰبنی اٰدم قد انزلنا علیکم لباساً یواری سواٰتکم و ریشاً...... (7/26)۔ وہ سونے کے زیورات۔ چاندی اور شیشے کے برتن۔ باریک اور دبیز ریشمی ملبوسات۔ اعلیٰ درجے کے صوفے (18/31, 76/13-15) اور اسی قسم کا دیگر سامانِ آرائش و زیبائش' جنتی زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بہ ہیئت مجموعی معاشرہ کا تمدنی معیار اتنا بلند ہونا چاہئے کہ یہ چیزیں تمام افراد معاشرہ کو میسر ہوں۔ جنتی زندگی میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنتی زندگی میں جو کچھ کسی ایک فرد کو میسر ہوگا' وہی کچھ دیگر افراد کو میسر ہوگا۔

(۱۴) مذہبی آزادی کا حق

مذہب کے معاملہ میں قرآنِ کریم ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے' صداقت کو' عقل و فکر کی رُو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا اس میں جور و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ قل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر...... (18/29)۔ ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو' اور اس کے بعد' جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد' یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں گزرے گی۔ اس سے سرتابی برتے گا' تو نقصان اٹھائے گا۔ اگر اسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ بات منشائے خداوندی کے

خلاف ہوگی کہ اسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔قرآن میں نبیؐ اکرم کو مخاطب کرکے فرمایا:۔۔ ولو شاء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا ......۔۔اگرتمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؟ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب‘ آنکھ بند کئے‘ بھیڑ بکریوں کی طرح‘ اسی راستے پر چلے جاتے۔لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے۔۔افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (10/99)۔تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں۔ یہ تو مشیت خداوندی کے خلاف ہوگا۔اس لئے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔اس سے زیادہ کا تو مکلّف نہیں۔لا اکرہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی ...... (2/256)۔غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیز ہوکر سامنے آچکا ہے۔اس کے بعد‘ دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا)۔اس لئے وہ مذاہب عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا۔وہ ایک دین‘ یعنی ضابطہ زندگی یا مملکتی نظام ہے۔وہ اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا کہ اس کی حدود مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظام مملکت قائم کریں۔۔ یہ تو ’’ریاست درونِ ریاست‘‘ (State Within a State) قائم کرنے کے مرادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔لیکن وہ اس سے بھی کچھ تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدود مملکت میں رہنے والے اپنے لئے مذہب کونسا پسند کرتے ہیں۔۔اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے۔وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز‘ یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے وہاں‘ تمام اہل مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجۂ جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد یزکرفیھا اسم اللہ کثیرا ...... (22/40)۔اگر اللہ انسانوں کے ذریعے‘ سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا‘ تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں۔عیسائیوں کے گرجے۔دیگر اقوام کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے ڈھا دی جاتیں۔لہٰذا‘ ان تمام معبدوں کی حفاظت‘ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے‘ جس کا ہر غیر مسلم‘ بطور اپنے حق‘ کے مطالبہ کرسکتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعت مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ۔۔ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم۔۔ تم‘ غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔تم ایسا کروگے تو وہ‘ اس کے جواب میں بربنائے جہالت‘ اللہ کو گالی دے دیں گے۔سو جس طرح تمہیں یہ برا لگے گا‘ اسی طرح انہیں‘ ان کے معبدوں کو تمہارا گالی دینا بھی برا لگتا ہے۔اصل یہ ہے کہ کذٰلک زینا لکل امۃ عملھم ...... (6/109)۔ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔تم ان تک حق کی

بات پہنچاؤ۔ جب یہ بر بنائے علم و بصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے، تو خود بخود، اپنے معبودانِ باطل کو چھوڑ کر، صحیح نظام زندگی اختیار کر لیں گے۔ تم ان سے مجبوراً ایسا نہیں کرا سکتے۔

لہٰذا، قرآن، نوع انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اس مقام پر میں، اپنے موضوع سے ذرا سے گریز (Digression) کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ خدا نے تو مذہب کے معاملہ میں انسان کو اس قدر آزادی عطا کی ہے، لیکن ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کو تو اس کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ چاہے اپنے مذہب پر رہیں اور چاہے اسے تبدیل کر لیں۔ لیکن ایک مسلمان کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مسلمان مذہب تبدیل کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں کہ اگر وہ اسلام چھوڑ کر، کوئی اور مذہب اختیار کرے تو اسے قتل کر دیا جائے گا، بلکہ یہاں تک بھی کہ اگر کسی معاملہ میں اس کے خیالات ان ارباب شریعت سے مختلف ہوں اور اس بنا پر یہ اسے مرتد قرار دے دیں، تو بھی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس کی تو ہر ایک کو آزادی ہوگی کہ وہ چاہے تو الدین (اسلامی نظام) کے تحت آ جائے اور چاہے اس کے باہر (غیر مسلم) رہے۔ لیکن اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ بطیّب خاطر اسلامی نظام اختیار کرے اور اس کے بعد اس نظام کے احکام میں سے جس حکم کو جی چاہے مانے اور جس سے جی چاہے انکار اور سرتابی اختیار کرے۔ اس قسم کی آزادی تو کسی مملکت میں بھی مل نہیں سکتی۔ اسے مملکت کے تمام قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی۔ ہاں! اگر وہ کسی وقت اس قسم کی اطاعت کو ناقابل قبول سمجھے، تو اسلام کو چھوڑ کر، کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔ اس کے بعد چاہے تو اسلامی مملکت میں غیر مسلم (ذمی) کی زندگی بسر کرے اور چاہے کسی اور ملک میں چلا جائے۔

اس گریز کے بعد، میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن کی رو سے، اگلا بنیادی حق ہے۔

(۱۵) سچی بات کہنے کا حق

قرآن کریم نے افراد کو سچی بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا کہ وہ حق بات کہیں یا نہ کہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لئے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کریم کہاں تک جاتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ یٰآیھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط...... اے جماعت مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم عدل و انصاف کو دنیا میں قائم رکھو۔ اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ سچی بات بلا رو رعایت کی جائے۔ اس ضمن میں تم سمجھ لو کہ جب کسی معاملہ کے متعلق کچھ کہنے کا وقت آئے تو یہ نہ خیال کرو کہ تم کسی پارٹی یا فریق کی طرف سے شہادت دینے کے لئے آئے ہو۔ تم یہ سمجھو کہ تم صرف اپنے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہو۔ شھداء للہ۔ پھر سچی بات کہہ دو۔ ولو علیٰ انفسکم...... خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی

کیوں نہ جائے۔ (آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن' انسان کو کس مقام تک لے جاتا ہے؟) او الوالدین و الاقربین ...... خواہ وہ تمہارے والدین یا دیگر عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔ ان یکن غنیا او فقیرا ...... جس کے خلاف یہ شہادت جاتی ہے' وہ امیر ہو یا غریب' اس کی پرواہ مت کرو۔ اس لئے کہ فاللہ اولیٰ بھما ...... اللہ کا حق ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یاد رکھو! اپنے مفاد کا تحفظ۔ عزیز رشتہ داروں کی محبت اور تعلقات۔ اس پارٹی سے نقصان کا احتمال جو دولت مند ہے یہ تمام جذبات تمہاری راہ روک کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا ...... تم ان جذبات کا اتباع قطعاً نہ کرو اور ہمیشہ عدل کے تقاضے کو ملحوظ رکھو۔ وان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا o (4/135)۔۔ نہ ہی تم توڑ مروڑ کر' ذومعنی بات کرو اور نہ ہی اس سے پہلو تہی کرو۔ ایسا کرنے سے ہو سکتا ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکو' لیکن تم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس لئے سچی بات کہنے کے لئے دھڑلے سے سامنے آؤ اور' لگی لپٹی بغیر' صاف صاف دوٹوک بات کرو۔

ادھر یہ کہا اور دوسری طرف معاشرہ سے تاکید کی کہ اس کا انتظام کرو کہ شہادت دینے والے کو' کوئی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔ ولا یضار کاتب ولا شھید (2/282)۔

(۱۶) اظہارِ خیال کا حق

اظہارِ خیال کا حق بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان اور حیوانات میں ایک بنیادی فرق یہ بھی بتایا ہے کہ حیوانات' اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی (انسانوں کی طرح) صلاحیت نہیں رکھتے اور انسانوں کو اس کی صلاحیت اور استعداد دی گئی ہے۔ فرمایا: خلق الانسان o علمہ البیان (55/3-4)۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے قوت گویائی (یا اظہارِ خیال کی صلاحیت) عطا کی۔ دوسری جگہ ہے: الذی علم بالقلم ...... (96/4)۔ خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے بھی اظہار خیال کی صلاحیت عطا کی۔ یعنی' زبان یا قلم کے ذریعے اظہارِ خیال کا حق اسے' انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

واضح رہے کہ اظہارِ خیال (یا خدا کی عطا کردہ کسی اور صلاحیت) کا خلافِ قانونِ خداوندی استعمال جرم قرار پائے گا اور مستوجبِ سزا۔ لیکن کسی صلاحیت کے خلافِ قانونِ خداوندی استعمال کو جرم قرار دینا' اور بات ہے اور اس حق کو سلب کر لینا' اور بات۔ ان صلاحیتوں کے غلط استعمال کو جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے حقِ استعمال کو سلب نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کرنا تو انسان کو حیوان بنا دینے کے مرادف ہوگا۔

(۱۷) رازوں کی حفاظت کا حق

قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے کہ کسی کے رازوں کی خواہ مخواہ ٹوہ لگائی جائے۔ ولا تجسسوا ...... (49/12)۔ اس کا ارشاد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد کو اس کی ضمانت دیتا ہے کہ ان کے راز' افشا نہیں کئے جائیں گے۔ (جرائم کی تحقیق کے سلسلہ میں ایسا کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے)۔ خط و کتابت کی حفاظت کا حق بھی اسی ذیل میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح وہ' ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی دیتا ہے

جب کہتا ہے کہ لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتیٰ تستانسوا...... (24/27)۔تم اپنے گھروں کے علاوہ، کسی اور کے گھر میں، ان کی اجازت کے بغیر مت داخل ہو۔

(۱۸) حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق

جس چیز کو عام طور پر حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے، قرآن اس کی حفاظت کا بھی حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول...... (4/148)۔اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بری بات کو خواہ مخواہ اچھالا جائے۔اس کی اصلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے ایسا کیا جائے۔۔۔پھر ارشاد ہے کہ لا یسخر قوم من قوم...... (49/11)۔کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کا مذاق نہ اڑائے۔ولا تنابزوا بالالقاب...... کسی کے الٹے پلٹے نام نہ رکھے جائیں۔محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے۔یٰآیھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ...... (49/12)۔اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے، اسے مجرم نہ سمجھا جائے، بلکہ کہا یہ جائے کہ ھٰذآ افک مبین (24/12)۔وھٰذآ بھتان عظیم o(24/16)اور یہی نہیں کہ ظن اور قیاس کی بنا پر، کسی کے سامنے اس کی برائی نہ کی جائے، بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہو گی اور غیبت سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔ ولا یغتب بعضکم بعضاً...... (49/12)۔اس قسم کے تاکیدی احکامات سے، قرآن، افراد کی حیثیتِ عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔

(۱۹) امن کی ضمانت

ان تمام حقوق سے آگے بڑھ کر، قرآنِ کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ لا خوف علیھم ولھم یحزنون (2/38)۔انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہو گا۔خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نام ہے۔لہٰذا، اس معاشرہ میں، ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہو گا اور حزن، اس افسردگی کو کہتے ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے۔لہٰذا، جہاں اس معاشرہ کا یہ فریضہ ہو گا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ، بیرونی خطرات سے امن میں رہیں، وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہو گی کہ وہ ان پریشانیوں کو دور کرے جو لوگوں کے لئے وجۂ افسردگی بنتی ہیں۔خوف اور حزن سے مامونیت، ایسی جامع کیفیت ہے جس میں داخلی اور خارجی، ہر قسم کے اندیشوں اور پریشانیوں سے حفاظت کا تصور آ جاتا ہے۔ اسی حفاظت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ لا تزروازرۃ وزر اخریٰ...... (6/165)۔اس میں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔یہ نہیں ہو گا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ذمہ داری کسی کی ہو اور اسے سرانجام کوئی اور دے، کام کسی کا ہو اور مفت میں بیگار کوئی اور بھگتے۔جرم کسی نے کیا ہو اور دھڑ کا کسی اور کو لگا ہوا ہو۔ یہ ہے امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔اس کا حصول ہر فردِ معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔

یہ ہیں، وہ بنیادی حقوق جنہیں قرآن، حقوقِ انسانیت کی حیثیت سے تسلیم کرتا، اور جن کی ضمانت قرآنی معاشرہ دیتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمائندہ چٹان کا پرویز صاحب سے انٹرویو

مندرجہ ذیل انٹرویو مرحوم شورش کاشمیری کی زیرادارت ہفت روزہ چٹان لاہور' کے نمائندہ جناب ممتاز لیاقت کے قلم سے 'چٹان' کے ۲۳ جولائی ۱۹۷۳ء کے شمارے کے صفحات ۹ تا ۱۶ پر باتصویر شائع ہوا۔ اس شمارے کے سرورق پر غلام احمد پرویز مرحوم کی فل سکیپ رنگین تصویر تھی اور یہ انٹرویو 'سخن ہائے گفتنی و ناگفتنی' طلوع اسلام لاہور کے مدیر جناب غلام احمد پرویز' کے عنوان سے چھپا اور اس کی تصاویر جناب صلاح الدین چودھری نے بنائیں یہ انٹرویو ماہنامہ طلوع اسلام لاہور کے اگست ۱۹۷۳ء کے شمارے میں بھی شائع ہوا۔ قارئین کے شوق و مطالبہ اور اس کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر یہ انٹرویو دوبارہ طلوع اسلام لاہور کی زینت بنایا جارہا ہے۔ (مدیر)

سوال نمبرا: (الف) اس وقت آپ کے نزدیک پاکستان اور اس قوم کا اہم ترین مسئلہ کیا ہے یعنی ایسا مسئلہ جو پاکستان کے لئے بقا اور استحکام کی خصوصیت رکھتا ہے۔ پھر ہم اس مسئلہ کے مثبت نتائج کیونکر حاصل کرسکتے ہیں۔

(ب) کیا اسلام حال یا مستقبل کے لئے ایک فعال قوت (Living Force) کی خصوصیت رکھتا ہے! جواب اثبات میں ہے تو اس خصوصیت کی بنیادیں کیا ہیں۔

جواب: ہم پاکستان میں ابھی تک ایک قوم (قرآن کریم کی اصطلاح میں امت واحدہ) نہیں بن سکے۔ ہم یا تو انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یا زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی زندگی۔ انفرادی زندگی میں اجتماعی مفاد کا تصور تک نہیں ہوتا اور قبائلی زندگی کا لازمی نتیجہ باہمی مخالفتیں' مخاصمتیں' عداوتیں' تصادمات' فسادات اور خون ریزیاں ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ہمارا بنیادی اور سب سے اہم مسئلہ ان منتشر افراد اور متصادم گروہوں کو ایک قوم (امت واحدہ) کے قالب میں ڈھالنا ہے۔

مغرب نے قومیت کا معیار وطن کا اشتراک قرار دیا تھا اور اسی معیار کے مطابق ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور ابھرا تھا۔ قرآن کریم نے قومیت (تشکیلِ امت) کا معیار ایمان کا اشتراک قرار دیا۔ اس معیار کی رو سے ساری دنیا کے انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔۔ ایک گروہ ان افراد کا جو ایمان میں مشترک ہوں اور دوسرا ان کا جن کا ان کے ساتھ ایمانی اشتراک نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر' قرآن کی رو سے دنیا میں دو ہی قومیں رہ جاتی ہیں۔۔ مسلم اور غیر مسلم۔۔ اسی کو ''دو قومی نظریہ'' کہا جاتا ہے' اس نظریہ کی بنیادوں پر ہم نے

پاکستان کا مطالبہ' اور پھر اس مملکت کو حاصل کیا تھا۔ لیکن حصول پاکستان کے بعد ہم نے خود ہی اس نظریہ کو خیر باد کہہ دیا' یعنی ہم نے پاکستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگوں' مسلمانوں اور غیر مسلموں ۔ ۔ کو ایک قوم قرار دے دیا۔ اگر ہم کھلے بندوں اس کا اقرار اور اعلان کر دیتے کہ ہمارا معیار قومیت' وطن کا اشتراک ہے نہ کہ ایمان کا' تو ہم اس بنیاد پر قوم کی تشکیل کر لیتے۔ لیکن ہم نے کیا یہ کہ عملاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا لیکن زبانی دو قومی نظریہ کے الفاظ دہراتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ہم ایمان کے اشتراک کی بنا پر مسلمانوں کو ایک قوم (امت واحدہ) بنا سکے اور نہ ہی وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم متشکل کر سکے۔ قرآن کریم کی رو سے تذبذب اور منافقت کا فطری نتیجہ' حبطِ اعمال اور تخریب مآل ہوتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ جب تک ہم اس باب میں ذہنی اور قلبی طور پر یکسو نہیں ہوتے ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اگر ہم وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم بننا چاہتے ہیں تو ہر چند یہ روش اسلام کے خلاف ہو گی' لیکن اس سے کم از کم مغربی انداز کی ایک قوم تو متشکل ہو جائے گی اور اگر ہم اسلام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو پھر دو قومی نظریہ کو دیانتداری سے عملاً نافذ کرنا ہو گا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے' اس نظریہ کے دو گوشے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی غیر مسلم' مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے اندر نسلی' لسانی' وطنی' ثقافتی' سیاسی' مذہبی' غرضیکہ کسی میلان و رجحان کے تابع تفرقہ پیدا کرنا اسلام سے برگشتگی اور مملکت کے خلاف بغاوت کی دلیل ہوتا ہے' کیونکہ اس سے امت کی وحدت باقی نہیں رہتی۔ جو توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن کریم بہ نص صریح امت میں تفرقہ کو شرک قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے موجودہ مسلمانوں کو' کہ جن کی تعلیم و تربیت اسلام کی رو سے نہیں ہوئی' بہر حال از روئے قانون ایک قوم بنانا ہو گا۔ یہ طریق کار ہنگامی اور عارضی ہو گا' مستقل اور پائیدار طریق عمل یہ ہو گا کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کریں کہ ایمان کے اشتراک کی رو سے وحدت امت' ان کے قلب کی آواز اور روح کی پکار بن کر ابھرے۔ میں شروع ہی سے دو قومی نظریہ کا مبلغ اور نظام تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی کا داعی چلا آ رہا ہوں۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کا اس کے سوا کوئی حل نہیں۔

(ب) اسلام ان ابدی اقدار خداوندی اور اصول سماوی سے عبارت ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ اس لئے یہ دین (نظام حیات) ہر زمانے کے لئے فعال قوت ہے۔ طلوع اسلام کی سابقہ سالانہ کنونشن میں میرے ایک خطاب کا عنوان تھا۔ ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے''۔ اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے میں نے بہ دلائل و شواہد بتایا تھا کہ قرآن کے پیش کردہ اصول زندگی اور نظریات حیات کس طرح عالم انسانیت کو متاثر کئے چلے آ رہے ہیں اور انسانی ذہن کس طرح انہیں غیر شعوری طور پر قبول کئے جا رہا ہے۔ قرآن کا نصب العین ان اقدار کی رو سے عالم بشریت کو ایک عالمگیر برادری میں متشکل کرنا ہے۔ ان اقدار میں احترام آدمیت اور مساوات انسانیہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اقوام عالم اپنی انفرادی مفاد پرستیوں اور گروہ بندانہ مصلحت

اندیشیوں کے تباہ کن نتائج سے اب اس قدر تنگ آ چکی ہیں کہ وہ اپنی خود پیدا کردہ تفریقات کو مٹا کر ایک عالمگیر برادری (Global Village) کی تشکیل کے لئے ترس اور تڑپ رہی ہیں لیکن اس کے لئے انہیں کوئی اساس نہیں مل رہی۔ قرآن وہ اساس محکم پیش کرتا ہے جو کبھی متزلزل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مفکرین عالم اب رفتہ رفتہ اسی نہج پر سوچ رہے ہیں۔

سوال نمبر۲: ہم اسلام کو ماضی کے گرد و غبار سے، جو ملوکیت، ملائیت اور تصوف سے پیدا ہوا ہے، کیوں کر نکال سکتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے حق و باطل اور غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے اپنی کتاب (قرآن مجید) کو معیار قرار دیا تھا۔ یہی اسلام میں سند اور حجت ہے۔ زمانۂ نزول قرآن میں مختلف اقوام میں جو کچھ مذہب کے نام سے پیش کیا جاتا تھا۔ قرآن نے اپنے اس معیار کے مطابق اس کا جائزہ لیا اور صحیح کو غلط سے الگ کر کے رکھ دیا۔ اس طرح وہ دین اپنی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے آ گیا۔ جسے نوع انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد، اس دین میں انسانی فکر اور دیگر مذاہب کے عقائد اور مسالک کو داخل کر کے اسے مذہب کی سطح پر لے آیا گیا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہم آج اسی مقام پر کھڑے ہیں، جس مقام پر نزولِ قرآن کے زمانے میں مختلف اہل مذاہب تھے۔ لہٰذا دینِ حقیقی سے ان غیر اسلامی تصورات و مسالک کو الگ کرنے کے لئے آج بھی وہی طریق اختیار کرنا ہوگا جو اس زمانے میں اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی اِس وقت جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اسے قرآن کے ترازو میں تول کر دیکھ لیا جائے۔ جو کچھ اس پر پورا اترے، اسے صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا جائے۔ جو غلط ثابت ہو۔ اسے مسترد کر دیا جائے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نہ نزول قرآن کے زمانہ میں اس کے لئے آمادہ ہوئی تھی، نہ اب آمادہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ''دین'' کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ''مذہب'' ہوتا ہے اسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ اسلام مذہب کے خلاف احتجاج ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں ان کے پیش نظر اسلام کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا پروگرام تھا، جس کا عمودی نکتہ یہی تھا۔ میں نے اس نظریہ کے مطابق انگریزی زبان میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام ہے۔ (Islam: A Challenge to Religion) اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور مغربی مفکرین بھی اس سے خاصے متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ دین اور مذہب کا یہ فرق ان کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔

اس ضمن میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بھی مختلف تعبیریں ہوسکتی ہیں، اس لئے غلط اور صحیح کے پرکھنے میں قرآنی معیار کے نتائج میں بھی فرق ہوسکتا ہے۔ اس قسم کے اعتراضات درحقیقت قرآن کو سند و حجت تسلیم نہ کرنے کے لئے گریز کی راہیں ہیں۔ قرآن کریم میں جو مابعد الطبیعاتی حقائق آئے ہیں، ان کے سمجھنے میں تو انسانی فکر میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن جن امور کا تعلق انسانی راہنمائی سے ہے (اور یہی قرآن کا بنیادی مقصد ہے) ان میں وہ بالکل واضح اور متعین تعلیم پیش کرتا ہے، جس کی مختلف تعبیریں ہو نہیں سکتیں۔

بشرطیکہ قرآن کو خود اس کے اپنے تجویز فرمودہ طریق سے سمجھا جائے۔

سوال نمبر۳: کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ علمائے سلف کے رشحات و اذکار پر آپ کی تنقیدیں نئی پود کے دماغوں اور دلوں میں اسلام کی ارادت کو کمزور کرتی ہیں اور پرانے لوگوں میں اشتعال کا باعث ہوتی ہیں۔

جواب: دین کے معاملے میں میرا مسلک وہ ہے جسے میں نے سوال نمبر۲ کے جواب میں بیان کیا ہے یعنی اس وقت جو کچھ ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) اسلام کے نام سے مروج ہے' میں اسے قرآن کے معیار کے مطابق پرکھتا ہوں اور جو عقیدہ' نظریہ' مسلک و مشرب اس کے خلاف جاتا ہے' اس کے متعلق کہتا ہوں کہ وہ اسلامی نہیں' غیر اسلامی ہے۔ میری تنقیدیں نہ علمائے سلف کے رشحات کے خلاف ہوتی ہیں' نہ خلف کے افکار کے خلاف۔ میری تنقیدیں ہر خلاف قرآن عقیدہ اور مسلک کے خلاف ہوتی ہیں۔ عقائد (خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں) انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے ہیں' اس لئے وہ ان کے خلاف کچھ سننے کے لئے بآسانی تیار نہیں ہوتا۔ (آپ نے دیکھا نہیں کہ ہندو گائے کے خلاف بھی ایک لفظ تک برداشت نہیں کرسکتا' حالانکہ اس پر ساری دنیا ہنستی ہے۔) جو کچھ میں قرآن سے پیش کرتا ہوں' اس کی تردید کے لئے چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتیں' اس لئے وہ خود بھی مشتعل ہو جاتا ہے اور عوام کو بھی مشتعل کرتا ہے۔ اندریں حالات میرے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو میں (اسوۂ رسول اللہﷺ کے اتباع میں) ان کے اشتعال کو برداشت کروں اور اپنے مشن پر استقامت سے قائم رہوں اور یا اس مشن کو چھوڑ دوں۔ یہ دوسرا راستہ میرے لئے دین و دنیا میں روسیاہی کا باعث ہوگا۔ اس لئے مجھے لامحالہ اپنی روش پر گامزن رہنا ہوگا۔ میں اپنی عمر کا بیشتر راستہ قطع کر چکا ہوں اور اب تھوڑی سی منزل باقی رہتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے اسی راستے پر استقامت سے گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں اتنی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی تنقیدات میں متقدمین یا متاخرین میں سے کسی کے خلاف کبھی بدتمیزی سے کام نہیں لیا۔ ہمیشہ تہذیب اور شرافت کے دامن کو تھامے رکھا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس سے ناراض ہوتا ہے کہ اسکے کسی بزرگ کی طرف منسوب کردہ کسی عقیدہ یا مسلک کے متعلق میں یہ کیوں کہتا ہوں کہ وہ خلاف قرآن ہے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی کسی تحقیق کے متعلق کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ حرفِ آخر ہے اور سہو و خطا سے پاک' میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے' جس میں سہو و خطا اور مزید غور و فکر کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ میں نے کوئی فرقہ بھی پیدا نہیں کیا کہ میری تحقیق میرے متبعین کے لئے سند اور حجت بن جائے۔ میں اپنے فکری نتائج کو پوری قوم کے سامنے پیش کرتا ہوں اور اسے دعوت غور وفکر دیتا ہوں۔ مقصد میرا یہ ہے کہ قوم میں سوچنے کی صلاحیت بیدار رہو اور وہ جس نظریہ یا عقیدہ کو قبول کرے علیٰ وجہ البصیرت قبول کرے۔ میری تنقیدات سے نئی پود کے دماغوں اور دلوں میں اسلام کی ارادت کمزور نہیں ہو رہی۔ اسلام سے ان کی

ارادت ان عقائد ونظریات کی وجہ سے کم ہو رہی ہے جسے ہمارا قدامت پرست طبقہ اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے۔ اسی سے وہ اسلام سے سرکشی اور برگشتگی کی حد تک پہنچ رہے ہیں۔ میری پیش کردہ قرآنی فکر سے ہزارہا نوجوان اسلام کے گرویدہ ہو چکے ہیں' اور یہ دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

سوال نمبر۴: علامہ اقبالؔ سے متعلق پاکستان میں جو کتابیں مختلف اہل قلم کی معرفت منصۂ اشاعت پر آئی ہیں کیا وہ اقبالؔ کی فکر سے انصاف کرتی ہیں؟

جواب: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ علامہ اقبالؒ سے متعلق پاکستان یا بیرون پاکستان جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں' وہ سب میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ لیکن جتنی کتابیں دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے' میں (ان کتابوں کے مصنفین سے معذرت کے ساتھ) عرض کروں گا کہ میرے نزدیک وہ اقبالؔ کی فکر سے انصاف نہیں کر پائے۔ حضرت علامہؒ نے' بہ تکرار و اصرار' اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ان کی فکر کا بنیادی سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ لہٰذا فکرِ اقبال سے وہ (اور صرف وہ) کتاب انصاف کر سکے گی جو ان کی پیش کردہ فکر کا جائزہ قرآنی فکر کی روشنی میں لے اور اسی بنیادی نکتہ کو اپنی تحقیق کا محور قرار دے۔

سوال نمبر۵: پاکستان کے صوبائی تعصّبات کو روکنے کے لئے ہم کن نظریاتی بنیادوں کو قوم کے اجتماعی ضمیر سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں؟

جواب: اصولی طور پر اس سوال کا جواب سوال نمبرا کے جواب میں مل جائے گا۔ ہمارے ہاں صوبوں کی اصل و حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ انگریز نے انتظامی سہولتوں کی خاطر ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن اب ان صوبوں کی لکیریں ایک دوسرے کو ڈسنے کے لئے سانپ بن گئی ہیں۔ حتیٰ کہ جو حضرات تقسیم ہند سے پہلے پورے ہندوستان میں بسنے والے باشندوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے اور اس پر انہیں شدت سے اصرار تھا' وہ اب مغربی پاکستان کی چار دیواری کے اندر ان صوبوں کی لکیروں کی بنیاد پر چار قومیتوں کے وجود کے داعی بن رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں عرض کیا ہے' اصلاً اور اساساً تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں لیکن' بہ حالات موجودہ' ایک مملکت کے اندر بسنے والے مسلمان تو ایک قوم تسلیم کئے جانے چاہئیں۔ مغربی پاکستان میں اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ ان صوبوں کی تفریق کو ختم کر کے پاکستان کو ایک ملک تسلیم کیا جائے اور ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر وحدت امت کے نظریے کو وہ اساس قرار دیا جائے' جس پر ہماری زندگی کی پوری کی پوری عمارت استوار ہو۔ ون یونٹ اس سمت ایک اچھا قدم اٹھایا گیا تھا لیکن افسوس کہ انتظامی خرابیوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا اور تفریق پسند گروہوں نے اس کی ناکامی سے فائدہ اٹھا کر ملک کو پھر چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر نظریہ پاکستان پر دیانتداری سے عمل کیا جائے تو ہمارے اس چھوٹے سے ملک میں وحدانی انداز حکومت کیوں کامیاب ثابت نہ ہو سکے۔ باقی رہا قوم کا اجتماعی ضمیر' تو جیسے میں نے پہلے عرض کیا ہے' یہاں

ابھی تک قوم ہی متشکل نہیں ہوئی تو اس کا اجتماعی ضمیر کہاں سے پیدا ہوگا؟ اجتماعی ضمیر پیدا ہوا کرتا ہے' وحدت فکر ونظر سے' جسے بالفاظِ دیگر' ایمان کہا جاتا ہے۔ ہماری ساری کوششیں افراد قوم میں اقدار خداوندی کی بنیادوں پر (جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں) ہم آہنگیٔ فکر ونظر پیدا کرنے کے لئے صرف ہونی چاہئیں۔ اس کے سوا صوبائی تعصّبات کے ختم کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

سوال نمبر۶: ہمارا ادب (نثر ونظم) کس رخ پر جارہا ہے؟

جواب: رخ' کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سامنے کوئی متعین منزل یا نصب العین ہو۔ اس وقت قوم کے سامنے کوئی متعین نصب العین نہیں' اس لئے اس کی فکر کے کسی خاص سمت جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت ہر طرف انتشار ہی انتشار ہے۔ انتشار کے اسی بگولے میں ہمارا ادب بھی عفریتی ناچ' ناچ رہا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس بگولے کی زد میں آکر بے مقصد حرکتوں میں مصروف ہے۔ جھکڑ میں ہواؤں کا رخ کب متعین ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ''ایمان'' تو ایک طرف ''کفر'' کا بھی کوئی رخ متعین نہیں۔

سوال نمبر۷: آپ پر احادیث کے استخفاف کے الزام کی نوعیت میں صحیح اور غلط کا تناسب کیا ہے؟

جواب: آپ نے میرے خلاف اس الزام کی یاد تازہ کرا کر۔۔اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔۔ جو شخص اس ہستی تک کا نام بصد عقیدت واحترام لیتا ہو' جس کی خاک کے ذروں کو عالم انسانیت کی بلند ترین ہستیﷺ کی پابوسی کا شرف حاصل ہے' اسکے متعلق یہ کہنا کہ وہ اس ذات اقدس واعظمﷺ کے ارشادات گرامی کا استخفاف کرتا ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اس سے سنگین تر الزام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ اس کی نوعیت میں صحیح اور غلط کے تناسب کا کیا سوال' یہ یکسر کذب اور افتراء ہے' جسے ایک منظّم پروپیگنڈے کی رو سے مسلسل پھیلایا گیا ہے اس پروپیگنڈے کی شدت اور وسعت سمجھ میں نہیں آسکتی' جب تک میں کوئی مثال پیش نہ کروں۔ میں عام طور پر شخصیتوں میں نہیں الجھا کرتا لیکن چونکہ مثال میں شخصیت کا ذکر ناگزیر ہے' اس لئے اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

محترم آغا شورش کاشمیری کی تالیف۔۔ فیضانِ اقبالؔ۔۔ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے' وہ اپنے اس مقدمہ میں' بلا موقع اور محل' مجھے گھسیٹ لائے ہیں اور فرماتے ہیں۔

> لاہور میں یہ بھی طلوع ہوا ہے کہ ایک شخص جو شخصیت رسول کی اہمیت گھٹانے پر مامور ہے اور دین کو کج رو امیر مسلمانوں کے سہل اور غیر ذمہ دار طرز زندگی کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک فرقے کی بنیاد رکھ چکا ہے' بدقسمتی سے اپنی مجلس کی رونق اشعار اقبال ہی سے بڑھا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص رسولؐ ہی کو نہیں مانتا اور اپنے آپ کو قرآن کا عمرؓ وابوبکرؓ سے بہتر مفسر سمجھتا ہے' وہ اقبالؔ کو کیا مانے گا۔ مگر رونق بڑھانے کے لئے اشعار اقبال کو یہ بھی گا تا ہے۔ (ص۲۳۔۲۲)۔

آپ غور کیجئے کہ ان چند سطروں میں کتنے الزامات ہیں جو

میرے خلاف عائد کئے گئے ہیں اوران میں سے ہرالزام کس قدرجگر پاش اور جاں سوز ہے' پھر یہ بھی سوچئے کہ جب' عوام کیا' خواص مسلمانوں تک کے سامنے کسی شخص کا یہ نقشہ کھینچا جائے توانکا خون کس قدر نہیں کھولے گا؟ میں نے حسب معمول اس زہرافشانی کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میرا دامن راستے کی ان خاردار جھاڑیوں میں الجھ جائے تو میں اپنی منزل کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکوں گا۔ لیکن طلوع اسلام کی سابقہ کنونشن میں کراچی کے ایک دوست نے اس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ جو بعد میں طلوع اسلام میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا گیا تھا کہ ان کے پاس ان الزامات کا کوئی ثبوت ہے؟ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب سے میری آج تک کبھی ملاقات نہیں ہوئی' وہ میرے درس یا کنونشن میں سامع کی حیثیت سے بھی کبھی شریک نہیں ہوئے لہٰذا ان الزامات کا ثبوت میری تحریروں ہی سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطوط میں اس کا اعتراف کیا کہ اس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ لکھا (کیونکہ وہ اپنے خطوط کی نقول مجھے بھی بھیجتے رہے تھے۔) کہ ان کے خطوط شائع نہ کئے جائیں۔

آپ سوچئے کہ جب ڈاکٹر سید عبداللہ جیسا ذمہ دار شخص میرے خلاف بلاثبوت اس قسم کے سنگین الزامات عائد کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا تو مذہبی مکاتب کے شوریدہ سر طلبا یا افسانہ گو واعظ کس حد تک نہیں جا سکتے؟ اگر ڈاکٹر صاحب نے میری صرف ایک کتاب ہی پڑھ لی ہوتی جو حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر مشتمل ہے اور جس کا نام۔۔''معراج انسانیت'' ہے اس امر پر دال ہے کہ میرے نزدیک مقام محمدیؐ کی رفعت وعظمت کیا ہے تو انہیں کم ازکم اس کا احساس ہو جاتا کہ وہ کس کے خلاف' کیا الزام عائد کررہے ہیں۔ میں نے یہ سیرت اصولاً قرآن کریم سے مرتب کی ہے اور اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کی ہیں جو ہمارے روایات کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو بڑی تقطیع کے قریب نوسو صفحات پر مشتمل ہے' ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور ملک میں کافی مقبول اور مشہور ہوا تھا۔ میں یہ تفصیل اس لئے عرض کررہا ہوں کہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قسم کی کتاب کا کم ازکم نام تو سید صاحب نے سنا ہوگا' اگر وہ پوری کتاب نہیں' اس کا ''مطلع انوار'' ہی ملاحظہ فرما لیتے تو انہیں اس کے آخر میں یہ سطور دکھائی دیتیں۔

> ''خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا' آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جوقوانین دیئے جانے تھے وہ ان کی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے' اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی اور مشعل راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذات اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ ؎
>
> مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
> بحق دل بند و راہِ مصطفیؐ رو

یہ تھا وہ حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات کہ جس کا ظہور صبحِ
بہارِ کائنات تھا۔''

یہ تھی ایک مثال اس پروپیگنڈہ کی جو میرے خلاف گذشتہ پچیس سال سے مسلسل جاری ہے۔

(۲) احادیث کی پوزیشن یہ ہے کہ ان کے متعلق کسی کا بھی یہ دعویٰ نہیں کہ وہ من وعن حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشادات ہیں۔ ان کے متعلق دعویٰ اور عقیدہ یہی ہے کہ وہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔ اس فرق کی وضاحت سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں' لازماً ایک ہی چیز نہیں اور نہ ان روایات کو استفسار کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں' بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبیؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (رسائل و مسائل' حصہ اول' ص ۲۷۰)۔

ان احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کے معیار کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور غلط ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (ان کے فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسول مان لینا ضروری ہے' جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (ایضاً ص ۲۹۰)۔

احادیث کے متعلق میرا بھی یہی مسلک ہے' اس فرق کے ساتھ کہ مودودی صاحب کے نزدیک اس بات کا فیصلہ کہ (فلاں حدیث جسے حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) صحیح ہے یا غلط ''مزاج شناسِ رسول'' کی نگہٗ بصیرت کر سکتی ہے اور میرا مسلک یہ ہے کہ

> 'کوئی روایت جو قرآن کریم کے خلاف ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس واعظم پر طعن پڑتا ہو' یا اس سے صحابہٗ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو' وہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے وہ معیار' جس پر میں احادیث کو پرکھتا ہوں اور جو اس معیار پر پوری نہیں اترتیں' ان کے متعلق کہتا ہوں کہ وہ رسولؐ اللہ کی احادیث ہو نہیں سکتیں' حضور ﷺ کی طرف ان کی نسبت غلط ہے۔ ان وضعی روایات میں ایسی بھی ہیں' جنہیں دیکھ کر انسان کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ جب میں مثال کے طور پر اس قسم کی وضعی روایات سامنے لاتا ہوں تو عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کر دیا جاتا ہے کہ دیکھئے یہ شخص (معاذ اللہ) احادیث رسولؐ اللہ کا استخفاف کرتا ہے۔ (گنجائش مانع ہے ورنہ میں اس قسم کی روایات کی چند مثالیں بھی پیش کرتا)۔

سوال نمبر۸: کیا آپ ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ مولنا ابوالاعلیٰ مودودی نے بہرحال (جزوی اختلافات

سے قطع نظر) نئی نسلوں کے اذہان میں اسلام کے لئے ارادت کی حد تک پختگی پیدا کی ہے؟

جواب: معاف فرمائیے' مجھے نہ صرف یہ کہ آپ کی اس رائے سے اختلاف ہے بلکہ میری رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ میری رائے اور تجربہ یہ ہے کہ نئی نسل کے سمجھنے سوچنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مودودی صاحب نے اسلام سے بری طرح برگشتہ کیا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ میری اس رائے سے سخت اختلاف کیا جائے گا لیکن میں کوئی بات بلا دلیل اور بلا ثبوت نہیں کہا کرتا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے لئے میرے پاس دلائل اور شواہد ہیں۔ اس سلسلے میں میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب سے میری کوئی ذاتی مخاصمت نہیں۔ ان کے ساتھ میرے نہایت خوشگوار تعلقات' ان کے قیام دکن کے دوران سے چلے آ رہے تھے۔ وہ دہلی تشریف لاتے تو ان کا میرے ہاں آنا جانا رہتا۔ انکے دارالاسلام (پٹھان کوٹ) تشریف لے جانے میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ (میں اس داستان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ موضوع زیرنظر سے اس کا بنیادی تعلق نہیں) میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کے شمالی ہند کی طرف منتقل ہونے تک اور اس کے بعد بھی ان کے ساتھ میرے تعلقات خوشگوار تھے لیکن جب انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تو میں نے پہلے انہیں اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس پر بھی انہوں نی اپنی روش نہ بدلی تو مجھے لامحالہ ان کی مخالفت کرنی پڑی۔ پاکستان آنے کے بعد خود اسلام کے متعلق جو روش انہوں نے اختیار کی' اسکی مجھے بڑی شدت سے مخالفت کرنی پڑی کیوں کہ مجھے اس کا احساس تھا کہ اس کے نتائج بڑے دوررَس اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔ یہاں میں اس امر کی مزید وضاحت کر دوں کہ میں نے نہ کوئی مذہبی فرقہ بنایا ہے نہ سیاسی پارٹی۔ نہ ہی میں عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہوں۔ اس لئے یہاں بھی ان کے ساتھ میری ذاتی مخاصمت یا رقابت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میری مخالفت اصولی ہے اور اس کا جذبہ محرکہ وہی ہے جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ ان کے پیش کردہ اسلام کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ ایک تو وہ ان کی مصلحتوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور دوسرے اس سے ایسے شکوک و شبہات ابھرتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ ایک سوچنے والے ذہن کو اسلام سے برگشتہ کر دیتے ہیں۔ ان کا پیش کردہ اسلام کس قدر تضادات کا مجموعہ اور شکوک و شبہات پیدا کرنے والے مواد کا مرکب ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک اچھی خاصی کتاب درکار ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کتاب کی بے حد ضرورت ہے۔ لیکن میں اس مقام پر اس کی دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ پہلے تضادات کو لیجئے۔

(۱) تشکیل پاکستان کے بعد پہلے انتخابات (۵۔۱۹۵۰ء) میں منعقد ہوئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا:

> اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو سب سے بڑھ کر جن چیزوں نے گندا کیا ہے' ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت

اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی۔ نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جوخود امیدوار ہواور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے‘ خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے‘ لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا‘ اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔ (جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد مطبوعہ ترجمان القرآن‘ اکتوبر ۱۹۵۰ء)۔

اس کے بعد جب ۱۹۵۶ء کے دستور کے ماتحت انتخابات کا موقع آیا تو انہوں نے ان میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں لکھا:

جماعت اسلامی نے ۵۱-۱۹۵۰ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے‘ اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے اور نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیار مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں...... اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی‘ انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔ (ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء)۔

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کا یہ اعلان اس سے پہلے فیصلے سے یکسر متضاد ہے لیکن اس کے ساتھ انہوں نے فرمایا کہ:

ہر معقول آدمی بہ یک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اسمیں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ایضاً)۔

اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر انہوں نے اعلان کیا کہ

جماعت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں حصہ لے گی اور مغربی اور مشرقی پاکستان کی تمام نشستوں پر اپنے آدمی کھڑے کرے گی۔ (انتخابی منشور کے سلسلے میں مودودی صاحب کا بیان --)۔

(۲) ایک مثال اور لیجئے۔ یہ سوال بڑا بنیادی ہے اور

ہمارے زمانے میں اس نے خاص طور پر اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اسلام کی رو سے ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہے یا نہیں اور کیا حکومت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ زمین کی انفرادی ملکیت کی تحدید کر دے۔ اس سلسلے میں مودودی صاحب نے اپنی کتاب (مسئلہ ملکیت زمین) میں لکھا تھا۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ و پیسہ' جانور' استعمال کی اشیاء' مکانات' سواری غرضیکہ کسی چیز کے معاملے میں قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملے میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دے۔ (مسئلہ ملکیت زمین' پہلا ایڈیشن' ص ۵۲-۵۳)۔

جہاں تک نیشنلائزیشن کا تعلق ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ

> اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے' جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ (ایضاً ص ۷۱)۔

لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر جب پیپلز پارٹی نے اس مسئلہ کو انتخابی مہم کا عمودی نکتہ بنا کر پیش کیا تو جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں لکھا۔

> قدیم املاک کے معاملے میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو اور دو سو ایکڑ کے درمیان ہوگی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان میں سو بیگھہ کی حد رکھی جائے۔

جہاں تک نیشنلائزیشن کا تعلق ہے' اس منشور میں کہا گیا کہ

> ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطور اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں لیکن جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی حیثیت سے چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے' انہیں قومی ملکیت میں بہ معاوضہ لے لینے یا خود حکومت کے انتظام میں قائم کرنے اور چلانے کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے۔

آپ سوچئے کہ جب ایک سنجیدہ' تعلیم یافتہ' نوجوان ان تضادات پر غور کرے گا اور ان کا اس دعویٰ کی روشنی میں جائزہ لے گا کہ یہ سب اسلام کے مطابق ہیں' تو اس اسلام کے متعلق وہ کس نتیجے پر پہنچے گا۔

اب اس مسئلہ کے دوسرے حصہ کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ مودودی صاحب کا پیش کردہ اسلام اور تو اور خود حضورؐ رسالتمآب کی ذاتِ گرامی کے متعلق کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کوئی پندرہ سولہ سال ادھر جماعت

اسلامی کے کچھ اراکین نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان میں اس جماعت کے بعض نہایت سربرآوردہ حضرات بھی شامل تھے۔ انہوں نے مودودی صاحب کے خلاف جو الزامات عائد کئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا' کہ وہ اکثر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا' کہ اگر میں نے یہ کچھ کیا ہے تو کون سا جرم کیا ہے۔ خود رسولؐ اللہ بھی (توبہ توبہ معاذ اللہ) یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اصولی طور پر یہ لکھا کہ

> راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں' جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

اس ''اصول'' کے بعد کہا:

> اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمدؐ بن مسلمہ کو جب حضور نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دے دی۔ (ترجمان القرآن' بابت مئی ۱۹۵۸ء)۔

میں یہاں اسے دہرا دوں کہ (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں) مودودی صاحب کے نزدیک ہمارے احادیث کے مجموعوں میں درج شدہ ہر حدیث صحیح نہیں ہے وہ صرف اسی حدیث کو صحیح مانتے ہیں' جسے ان کی نگہ بصیرت صحیح قرار دے دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس حدیث کو خود اپنی تحقیق کی رو سے تسلیم کرتے ہیں۔

ان کے خلاف دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جماعت کی تاسیس کے زمانے میں وہ بڑے بلند آہنگ اصول پیش فرمایا کرتے تھے' لیکن جب وہ پاکستان میں اقتدار کے پیچھے پڑے تو انہوں نے ان تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے جواب میں بھی مودودی صاحب نے فرمایا کہ (معاذ اللہ) خود رسولؐ اللہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش۔ ''امام قریش میں سے ہوں گے''۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل ومسائل حصہ چہارم' ص ۳۰-۳۲۹)۔

آپ سوچئے کہ جو کچھ مودودی صاحب فرما رہے ہیں' اس سے ہماری نئی پود کے سنجیدہ طبقہ کے ذہن میں' اسلام تو ایک طرف خود ذات رسالتمآبؐ کے متعلق کیا تصور پیدا ہوگا۔

ضمناً یہ دونوں روایتیں وضعی ہیں۔ اس لئے کہ یہ قرآن کریم کی تعلیم کے بھی خلاف ہیں اور حضور نبی اکرمﷺ کی پاکیزہ اور بلند سیرت کے بھی منافی لیکن مودودی صاحب انہیں صحیح قرار دیتے ہیں کیونکہ اس سے انہیں اپنے موقف کی تائید حاصل ہوتی ہے اور ایسا کرنے میں یہ خیال انہیں قطعاً نہیں ستاتا کہ ان کے اس نشتر کی زد کہاں تک پہنچتی ہے وہ اکثر ایسا کرتے ہیں۔ اس قسم کی ہیں وہ روایات جن کی میں مخالفت کرتا ہوں اور جس کی پاداش میں مجھے منکر حدیث' منکر شانِ رسالت اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں ان روایات کو غلط کیوں قرار دیتا ہوں بلکہ اس لئے کہ ان کے غلط قرار دینے سے خود مودودی صاحب بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

اس کے بعد آیئے قرآنی حقائق کی طرف۔ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کی حال ہی میں تکمیل ہوئی ہے۔ اس پر جس شان کے جشن منائے گئے ہیں اور اس تفسیر کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے' اس سے آپ واقف ہوں گے' لیکن دیکھئے کہ اس تفسیر میں کس قسم کا قرآن پیش کیا گیا ہے۔ صرف دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) تفسیر کی پہلی جلد میں کہا گیا ہے (اور اس کی تفصیل اس سے پہلے مودودی صاحب اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم میں بھی بیان کر چکے ہیں) کہ جنگ میں گرفتار شدہ دشمن کی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور وہ ان سے بغیر نکاح اور بلا لحاظ تعداد جنسی تمتع کر سکیں گے اور جب جی چاہے انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔ (تفہیم القرآن' جلد اول ۱۹۵۱ء ایڈیشن' ص ۳۴۰ و تفہیمات حصہ دوم' ص ۲۹۲ سے آگے)۔

(۲) جنت کی حوروں کے متعلق وہ اپنی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں۔ ''بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سنِ رشد میں پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہل جنت کی خدمت کے لئے مقرر کر دیئے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے' اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہل جنت کے لئے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ (تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص ۲۸۷)۔

(۳) سورہ الرحمٰن کی آیت حور مقصورات فی الخیام کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

خیموں سے مراد غالباً اس طرح کے خیمے ہیں' جیسے امراء و روساء کے لئے سیر گاہوں میں لگائے جاتے ہیں اغلب یہ ہے کہ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے' جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔ ہمارے اس قیاس کی

بنا یہ ہے کہ پہلے خوب سیرت اور خوب صورت بیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے' اس کے بعد اب حوروں کے ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ ان بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی۔ (تفہیم القرآن' جلد پنجم' ص ۲۷۱)۔

میں انہی دو چار مثالوں پر اکتفاء کرتا ہوں ورنہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) اگر ان کے پیش کردہ اس قسم کے ''نوادرات'' کو یکجا کیا جائے تو اس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد میں' اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس بات کا فیصلہ ارباب دانش وبینش پر چھوڑتا ہوں کہ اس سے نوجوانوں کے اذہان میں اسلام کے لئے ارادت پیدا ہوگی یا نفرت؟ اس سے پہلے صورت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی نوجوان اس قسم کی لغویات پیش کرتا تو اسے سمجھا دیا جاتا۔ کہ یہ جہلاء کی باتیں ہیں' اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اب وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام وہ شخص پیش کر رہا ہے' جسے دنیائے اسلام کا عظیم ترین مفکر اور علوم جدیدہ پر وسیع نگاہ رکھنے والا محقق کہا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ انہیں جہلاء کی باتیں کہہ کر مسترد نہیں کر سکتے اور اب تو یہ مصیبت اور بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ اب مودودی صاحب کے اس تعارف کے ساتھ ان کی کتابیں انگریزی میں بھی منتقل ہورہی ہیں' اس سے دشمنان اسلام کو اسلام پر وار کرنے کے لئے جس قسم کے حربے ہاتھ آجائیں گے' وہ ظاہر ہے۔ چونکہ عظمت قرآن اور ناموس رسالت کا تحفظ میرا جزو ایمان اور نصب العین حیات ہے اس لئے میں مودودی صاحب کے پیش کردہ اس قسم کے اسلام کی مخالفت اپنا فریضہ سمجھتا ہوں اور یہی وجہ ہے جو میرے خلاف اس قدر شدید پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر۹: کیا اسلامی وفاق کا قیام ممکن ہے۔ ممکن ہے تو کب' کہاں اور کس طرح۔ اس کا ابتدائی نقشہ کیا ہوگا؟

جواب: اسلامی ممالک کا وفاق اسی صورت میں ممکن ہے' جب ان کے دل میں اس حقیقت کو بیدار اور جاگزیں کیا جائے کہ اسلام میں قومیت کا معیار وطن اور نسل کا اشتراک نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ اس معیار کی رو سے دنیا کے مسلمان الگ الگ قومیں نہیں بلکہ ایک امت ہیں۔ اس حقیقت پر یقین کے بعد آغازِ کار کے لئے یہ ہوسکتا ہے کہ موجود مختلف مملکتیں انتظامی مقاصد کے لئے الگ الگ شکل میں قائم رہیں اور بنیادی امور کے لئے ان میں وفاق یا میثاق قائم کر دیا جائے اور پھر وہ رفتہ رفتہ ایک مرکز کے تابع آجائیں۔ جب یہ مرکز قرآن کے تابع ہوگا تو اسے ''خلافت علیٰ منہاج نبوت'' کہا جائے گا۔

سوال نمبر۱۰: مختصراً وہ کون سی غلط اصطلاحیں' الفاظ اور عقائد ہیں جو اصل اسلام میں نہیں تھے لیکن صدیوں کی گردش سے بہمہ وجوہ مسلمانوں کے افکار کا حصہ ہوگئے ہیں؟

جواب: اس سوال کا جواب بڑی تفصیل چاہتا ہے' جس کی اس انٹرویو میں گنجائش نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں گذشتہ قریب تیس پینتیس سال سے اسی سوال کا جواب دینے میں اپنی زندگی صرف کر رہا ہوں۔

دین خدا کی طرف سے خالص اور منزہ شکل میں ملتا

ہے۔اس کے بعد اس میں دو بنیادی تبدیلیاں پیدا کرائی جاتی ہیں جن سے وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک یہ کہ انسانوں کے خودساختہ نظریات' معتقدات یا رسوم ومسالک کو (خود وضع کر کے یا دوسروں سے مستعار لے کر) دین کا جزو بنا دیا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ دین کی اصطلاحات کا مفہوم بدل دیا جاتا ہے۔ اسلام بھی مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے جس میں یہ دونوں تبدیلیاں آ گئی ہوئی ہیں۔ دین کا صحیح نقشہ سامنے لانے کے لئے بنیادی طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ ان مروجہ الفاظ اور اصطلاحات کا دین کی رو سے مفہوم کیا تھا اور اب ان سے کیا مفہوم لیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی بساط اور بصیرت کے مطابق اپنی مرتب کردہ ''لغات القرآن'' میں یہی کیا ہے اور اپنی مختلف تصانیف میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہمارے ہاں کون سے غیر قرآنی عقائد اور تصورات ہیں جو اسلام کا جزو بن چکے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے۔اس کے لئے پورے کے پورے مروجہ اسلام کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لینا ہوگا کہ' ان تمام تحریفات اور تغیرات کے باوجود' خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس نے لے رکھا ہے۔

سوال نمبر11: اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں کن باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہم اس کی اجتماعی روح سے آشنا ہوتے رہیں؟

جواب: ''اسلامی تاریخ'' کی اصطلاح وضاحت طلب ہے۔ ایک چیز ہے اسلام کی تاریخ اور دوسری چیز ہے مسلمانوں کی تاریخ' اسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ اسلام درحقیقت تھا کیا اور پھر وہ کس طرح رفتہ رفتہ مروجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا۔ جہاں تک میرا علم میری راہنمائی کرتا ہے اسلام کی اس قسم کی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ باقی رہی مسلمانوں کی تاریخ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں کی سلطنتوں اور حکومتوں کی تاریخ ہے۔

عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کی تاریخ میں اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں فرق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس دور ہمایوں میں مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ بھی ہمارے پاس اپنی حقیقی اور غیر ملوث شکل میں نہیں آئی۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی جامع تاریخ' تاریخ طبری ہے۔ جسے ام التواریخ کہا جاتا ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی کے ابتداء میں' کسی سابقہ مستند تحریری ریکارڈ کے بغیر' روایات کی رو سے مرتب ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے اس میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ اس کے بعد مرتب ہونے والی کتب تاریخ کی بنیاد بھی یہی تاریخ ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وضعی احادیث اور ہماری تاریخ ہے ان میں ہر شخص کو اپنے اپنے نظریے کی تائید میں روایات مل جاتی ہیں جسے وہ اسلام کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ امت کے اختلافات' نزاعات' تفرقات اور غیروں کی طرف سے اعتراضات کا سرچشمہ بھی یہی چیزیں ہیں۔ جہاں تک عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کا تعلق ہے اس کی منزہ تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ حضور نبیؐ اکرم اور صحابہ

کبارؓ کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ان کی زندگی قرآن کریم کے مطابق تھی لہٰذا ہمیں اس دور کی تاریخ کو قرآن کی چھلنی میں چھان لینا چاہئے۔ جو اس کے مطابق ہو۔ اسے صحیح سمجھ لینا چاہئے۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دینا چاہئے۔ میں نے اپنی کتابِ سیرت (معراج انسانیت) کو اسی معیار کے مطابق مرتب کیا ہے اور اس کا نتیجہ بڑا شاداب اور درخشندہ سامنے آیا ہے۔ اسے ہم پورے حتم واعتماد کے ساتھ غیرمسلموں کے ہاتھ میں دے سکتے ہیں۔ اس نے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل و دماغ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

باقی رہی بعد کے دور کے مسلمانوں کی تاریخ تو نہ ہم ان کے اعمال و کردار کی صداقت کے لئے مکلّف ہیں' نہ ہی انہیں اسلام کے لئے سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر۱۲: کیا ہم یورپ کی علمی قیادت کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ اگر چیلنج کر سکتے ہیں تو اس کی اساس کیا ہو گی اور اس کی زبان کیا ہونی چاہئے۔

جواب: یورپ (یا کسی اور قوم یا ملک) کی علمی قیادت کا سوال ایسا نہیں جسے کوئی بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ علم الاشیاء (یعنی علم کائنات) کے حصول کی استعداد آدم (یعنی آدمی) کے اندر رکھ دی گئی ہے' جو قوم بھی اس صلاحیت اور استعداد سے کام لے گی وہ اس علم میں آگے بڑھ جائے گی' ایک وقت میں مسلمانوں نے اس سے کام لیا' امامت اقوام ان کے حصے میں آ گئی' اب یورپ کی اقوام نے اس سے کام لیا ہے تو وہ آگے بڑھ گئی ہیں۔ اگر مسلمان اس کے لئے پھر کوشش کریں گے تو یہ ان سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اصل سوال ان مقاصد کا ہے' جن کے لئے اس علم کو حاصل کیا جاتا' اور ان اقدار کا جن کے مطابق اس علم کو استعمال کیا جانا چاہئے۔ یہ مقاصد اور اقدار وحی کی رو سے متعین اور عطا ہوئی ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جو قوم علم کو ان مقاصد کے لئے حاصل اور ان اقدار کے مطابق صرف کرے گی' نوع انسان کی امامت اس کے حصے میں آئے گی۔ باقی رہا زبان کا سوال سو قرآن کریم کی زبان عربی ہے' اس لئے اس سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری ہے' جہاں تک علوم کائنات کا تعلق ہے اتفاق سے اس کا عظیم اور کثیر ذخیرہ انگریزی زبان میں ہے۔ اس علمی ذخیرہ سے متمتع ہونے کے لئے اس زبان کی تحصیل بھی ناگزیر ہے۔ جو قوم اس زبان سے (یا اس قسم کی کسی دوسری زبان سے جس میں یہ سرمایہ ہو) بیگانہ ہو جائے گی' وہ اپنے آپ کو نوع انسان کے ایسے گراں بہا ورثہ سے محروم کرے گی' اور اس کی یہ کمی کسی اور طرح بمشکل پوری ہو سکے گی۔

سوال نمبر۱۳: اپنے دماغی ارتقاء کی سرگزشت بیان فرمایئے؟

جواب: اپنے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت کے بارے میں اس کے سوا کیا کہوں کہ ؎

تفصیلِ معنیٔ غم الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

میری پیدائش (۱۹۰۳ء میں مشرقی پنجاب کے قصبہ بٹالہ ضلع

گورداسپور) کے ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو شریعت اور تصوف دونوں کا گہوارہ تھا۔ میرے دادا حنفی مسلک کے ایک ممتاز عالم اور چشتیہ نظامیہ خانوادہ سے متعلق اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ میری تعلیم و تربیت بھی انہی کے آغوش میں ہوئی اور انہی کے زیرِ نگرانی میں نے سلوک کی منازل بھی عملاً طے کیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھے نسبتاً چھوٹی عمر ہی میں ان دونوں میدانوں میں بہرۂ وافر حاصل ہوگیا۔ بٹالہ ویسے بھی ایک مذہبی شہر تھا' اس لئے (اس دور کی عام فضا کے مطابق) وہاں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علاوہ آریوں' عیسائیوں اور قادیانیوں سے اکثر مناظرے رہا کرتے تھے۔ اس طرح مجھے فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کا بھی موقعہ مل گیا۔ بعد میں مختلف فرقوں کے باہمی مباحثوں یا آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کا دور تو ختم ہوگیا لیکن۔ ختم نبوت کے موضوع پر میں مسلسل لکھتا چلا آرہا ہوں کہ میرے نزدیک انکارِ ختم نبوت کا فتنہ امت کے لئے بڑا خطرناک ہے۔ چونکہ میں اس مسئلہ پر قرآن خالص کی روشنی میں گفتگو کرتا ہوں' روایات میں نہیں الجھتا' اس لئے فریق مقابل کے پاس میرے دلائل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ (بہرحال میں اپنے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت بیان کررہا تھا) میں نے طبیعت کچھ ایسی پائی تھی کہ جب تک کسی معاملہ میں ذاتی طور پر مطمئن نہیں ہو جاتا تھا' وہ دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتی تھی' چنانچہ جب ذرا بڑا ہوا اور اسی افتادِ طبیعت کے تقاضے سے اپنے طے شدہ راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو شکوک و شبہات ابھر ابھر کر سامنے آتے چلے گئے۔ یہ دور میرے لئے بڑا کرب و اذیت کا تھا۔ جس (موہوم) ''جنت'' میں اس وقت تک مطمئن چلا آرہا تھا' وہ چھنتی جارہی تھی اور اس کی جگہ اطمینان اور سکون کی کوئی صورت پیدا نہیں ہورہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میرے ایمان کی کشتی ریب و تشکیک کے ان طوفانوں میں ڈوب جاتی اگر ایک محکم لنگر اس کا سہارا نہ بنتا۔ یہ لنگر تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس و اعظم سے میری والہانہ عقیدت۔ روایات و تفاسیر کی رو سے جو قرآن سامنے آتا تھا اس کے متعلق ذہن یہاں تک پہنچ جاتا تھا کہ یہ خدا کا کلام تو ایک طرف کسی بلند انسانی فکر کی تخلیق بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس وقت یہ خیال میرا دامن تھام لیتا تھا کہ جب اس قدر بلند اور پاکیزہ سیرت کی حامل ہستی ﷺ یہ کہہ رہی ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے' اس میں اور تو اور خود میری فکر کا بھی کوئی دخل نہیں تو اس باب میں مجھے کسی آخری نتیجہ تک پہنچنے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہئے۔ اس مقام پر فکرِ اقبالؒ نے میری راہنمائی کی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس چیز کو وہ اسلام کے خلاف ''عجمی سازش'' قرار دیتے ہیں' مجھے اس کا سراغ لگانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے کئی برس اس تحقیق میں گزارے کہ جن عناصر کے مجموعہ کا نام مروجہ اسلام ہے' ان کا سرچشمہ کیا ہے اور وہ کس طرح اسلام کا جزو بن گئے ہیں۔ للہ الحمد کہ میری یہ خارہ شگافی بامراد ثابت ہوئی اور میں نے علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا کہ ہمارا مروجہ اسلام حقیقی اسلام نہیں۔ یہ میری منزل کا حصہ ء لا تھا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر یہ اسلام نہیں تو پھر اسلام ہے کیا؟ اس سوال کا جواب بھی مجھے پھر اقبالؒ ہی کے ہاں سے ملا کہ اسلام کا سرچشمہ قرآن ہے اور قرآن کے سمجھنے کا طریقہ (انہی کے الفاظ میں) ''محاورۂ عرب اور تصریف

آیات'' ہے۔ چنانچہ میں نے اس طریق سے قرآن کریم کے سمجھنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے اس کے الفاظ کا مفہوم اسی نہج سے متعین کیا جو میری ''لغات القرآن'' کے اندر محفوظ ہے۔ پھر تصریف آیات کا سوال سامنے آیا۔ تصریفِ آیات سے مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک موضوع کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے' اسے یکجا اپنے سامنے رکھا جائے اور پھر ان آیات کے الفاظ کے صحیح مفہوم اور سیاق وسباق کے مطابق یہ دیکھا جائے کہ قرآن اس موضوع کے متعلق کیا راہنمائی دیتا ہے۔ قرآن ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے اور میں گذشتہ قریب تیس سال سے مسلسل اور متواتر اپنا وقت اور توانائی اسی میں صرف کر رہا ہوں اور اب علیٰ وجہ البصیرت' پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب عظیم بلا شک وشبہ خدا کا کلام ہے اور پوری نوع انسان کے لئے مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو میں گویا ایک ایسا نومسلم ہوں جو علیٰ وجہ البصیرت ایمان لایا ہو۔

قرآن کریم اور اس کی روشنی میں حضورﷺ کی سیرت طیبہ کے خصائص کبریٰ کو سمجھ لینے کے بعد مجھ پر یہ فریضہ عائد ہوا کہ۔۔ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دوں۔۔ میری تمام تصانیف' جن میں لغات کے علاوہ' پورے کے پورے قرآن کا مفہوم' اور معراج انسانیت بھی شامل ہے۔ نیز میرے مضامین' میری تقریریں' میرا درس قرآن سب اسی فریضہ کی ادائیگی کے عملی مظاہر ہیں۔ میرا سرنیاز بدرگاہ رب العزت قدم قدم پر سجدہ ریز ہے کہ اس نے میری اس سعی ناتمام کو شرف قبولیت سے نوازا ہے اور چونکہ میرا اولین مخاطب طبقہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے' اس لئے اس کا ایک کثیر گروہ اسلام کا گرویدہ ہو رہا ہے۔

یہ ہے میری زندگی اور یہ ہے میرے ذہنی ارتقاء کی سمٹی ہوئی تفصیل۔ میں نے نہ کوئی سیاسی پارٹی بنائی ہے نہ ہی کسی مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈالی ہے کہ فرقہ بندی قرآن کی رو سے شرک ہے۔ میں علیٰ حد وسعت ارکان اسلام کی تعمیل دوسرے مسلمانوں کی طرح ہی کرتا ہوں اور بار بار اس کا اعلان کرتا ہوں کہ کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرے یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے۔ میں عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتا۔ قوم کے سامنے جو سوال آتا ہے' قرآن کریم اور سیرت طیبہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتا ہوں اور جو کچھ مجھے وہاں سے ملتا ہے اسے بلا کم وکاست اور بلا لحاظ لومۃ لائم قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ میں نہ اپنی فکر کے نتیجے کو سہو وخطا سے منزہ سمجھتا ہوں' نہ اس پر اصرار کرتا ہوں کہ اسے ضرور قبول یا اختیار کیا جائے۔ میری زندگی کا مشن قرآنی فکر کا عام کرنا ہے۔ دعا ہے کہ زندگی کا جو حصہ ابھی باقی ہے' وہ بھی اسی نہج پر گزر جائے۔

والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید قاسم محمود

تہذیبی کشمکش اور مسلم نفسیات

امریکی دانشور اور مصنف سیموئیل پی ہنگٹن نے اپنی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' (Clash of Civilizations) لکھنے سے پہلے اپنے ایک ہم وطن دانشور ہنری کسنجر کا ایک قول پڑھ رکھا تھا جو اس نے سرد جنگ کے زمانے میں لکھا تھا کہ ''اکیسویں صدی میں بین الاقوامی نظام چھ طاقتوں پر استوار ہوگا یعنی امریکہ، یورپ، چین، روس اور ممکن ہے کہ انڈیا''۔ مصنف نے جب قلم اٹھایا تو سرد جنگ ختم ہو چکی تھی اور اکھاڑے میں صرف امریکہ دندناتا رہ گیا تھا۔ اب مقابلہ تو بہرحال کسی نہ کسی سے کرانا تھا، اس لئے مصنف نے ''طاقتوں'' کا لفظ مصلحتاً کاٹ کر لفظ ''تہذیبیں'' رکھ دیا اور مذکورہ چھ تہذیبوں کو پٹی پٹائی ثابت کرنے کے لئے اس نے کہا کہ ان چھپن ریاستوں کو نہیں بھولنا چاہئے جو بے شک الگ الگ تاریخ، جغرافیہ، زبان، ثقافت اور تمدنی روایات رکھتی ہیں لیکن اسلام کی رسی میں بندھ کر بلائے جان بن سکتی ہیں۔ پس چونکہ مسلمان دنیا کو ''دارالامن'' اور ''دارالحرب'' میں بانٹتے ہیں اس لئے امریکی دانشوروں کو بھی دنیا کو ''امن کے علاقوں'' اور ''حرب و ضرب کے علاقوں'' میں تقسیم کر لینا چاہئے۔ مصنف بڑا دانا اور زیرک ہے۔ گزشتہ تین ہزار سال کے دوران میں ابھرنے اور ڈوبنے والی تہذیبوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور ان کی باہمی کشمکش کی داستان پر اس کی نظر بہت گہری ہے اور اسی لئے وہ دور اندیش بھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا خالی وقت نہیں آیا جب دو تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم نہ رہی ہوں اور طاقتور تہذیب نے کمزور تہذیب کو ملیامیٹ نہ کیا ہو اور طاقتور سے طاقتور تہذیب خواہ کتنی بھی بلندی پر گئی ہو، ایک نہ ایک دن گرتی ضرور ہے۔ پس مغربی تہذیب بھی ایک نہ ایک دن ضرور گرے گی لیکن اس تہذیب کو موجودہ عروج مسلسل ساڑھے پانچ صدیوں کی سخت کاوشوں کے بعد حاصل ہوا ہے اس لئے اسے زوال آتے آتے بھی پوری ایک صدی لگ جائے گی۔ چنانچہ اکیسویں صدی پر تو لازماً مغرب کی برتری قائم رہے گی اور اگر وہ بائیسویں صدی میں خود کو برقرار رکھنا چاہے تو اس کی بنیادی ذمہ داری مغربی تہذیب کے موجودہ اجارہ دار امریکہ پر عائد ہوتی

ہے۔ امریکہ مغربی تہذیب کے تحفظ اور اس کے عرصۂ زوال کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے لئے مندرجہ ذیل آٹھ تدابیر پر سختی سے عمل کرے۔ (۱) یورپ کے ساتھ سیاسی، معاشی اور عسکری روابط کو وسعت دے۔ (۲) دوسرے ملکوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی پالیسیوں کو مربوط بنائے۔ (۳) یورپی یونین اور نیٹو کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے۔ (۴) لاطینی امریکہ کو جدیدیت کے رنگ میں رنگا جائے اور اس میں شامل ملکوں کو یورپی ممالک کے قریب لا کر ان میں سیاسی و معاشی اتحاد پیدا کیا جائے۔ (۵) مسلم ملکوں اور چین کی روایتی اور غیر روایتی فوجی طاقت کی ترقی میں ہر ممکن طریقے سے رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ (۶) جاپان کے مغرب سے دور ہونے اور چین سے قریب ہونے کے رجحان کو سختی سے روکا جائے۔ (۷) روس کو آرتھوڈوکس عیسائیت کی مرکزی ریاست تسلیم کر لینا چاہئے۔ (۸) دوسری تہذیبوں پر امریکی تہذیب کی فوجی اور تکنیکی برتری کو برقرار رکھا جائے اور فوجی مقابلے کی دوڑ میں کسی اور تہذیب کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ امریکہ کے اس محبّ وطن دانشور نے یہ آٹھ تجاویز دے کر گویا امریکی عوام اور حکومت کے سامنے اکیسویں صدی کا لائحہ عمل پیش کر دیا ہے جس سے اتفاق کرنا کسی کے لئے ضروری نہیں۔ اتفاق نہ سہی، مگر رنجش ضرور پیدا ہوتی ہے، خصوصاً اس وقت جب وہ دانشوری کی کرسی سے اتر کر پادری کا روپ دھار لیتا ہے اور لفظ ''تہذیب'' کو مذہب کے ہم معنی قرار دے کر اعداد و شمار کی صورت میں یا طنزیہ پیرائے میں اسلام اور مسلمانوں پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔ عیسائیت کا فروغ صرف تبدیلی مذہب سے ہوتا ہے جبکہ اسلام دوہری وجوہ سے پھیلتا ہے، تبدیلی مذہب سے بھی اور زیادہ شرح پیدائش کی وجہ سے بھی جو کثرت ازدواج کا نتیجہ ہے۔ اس حساب سے 2025ء تک مسلمانوں کی آبادی پوری دنیا میں سب مذاہب سے زیادہ ہو جائے گی۔

فاضل مصنف نے بڑی قابلیت سے چار سو صفحات کی کتاب میں فروغ اسلام کی تیسری وجہ کی طرف اشارہ تک نہیں ہونے دیا۔ یہ اعتراف کرنے پر تو وہ مجبور تھا کہ جو مذہب مغرب میں سب سے زیادہ پھیل رہا ہے وہ اسلام ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ اہل مغرب اگر اسلام قبول کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن اور نری مادیت سے گھبرا کر جب کسی بہتر سادہ اور قابل عمل عقیدے کی جستجو کرتے ہیں تو وہ اسلام کے سوا انہیں کہیں اور نظر نہیں آتا۔

مصنف اسلامی نظام ریاست کو مغربی طرز حکومت سے نیچا دکھانے کے لئے الٹی دلیل دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں مذہب اور ریاست علیحدہ ہوا کرتے تھے۔ چرچ اور ریاست کی دوئی مغربی تہذیب کی اہم خصوصیت ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اسلام مذہب اور ریاست کی یکجائی پر زور دیتا ہے۔ وہ اپنے ہم خیال ایک دوسرے مغربی مفکر، پائپس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے:

اسلام کے پاس کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہے۔ جدیدیت کے حصول کے لئے مغربیت کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اسلام جدیدیت کا کوئی متبادل پیش نہیں کرتا۔ سیکولرازم سے بچنا ناممکن ہے۔ جب جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کو اختیار کیا جاتا ہے تو اس فلسفے کو بھی ماننا پڑتا ہے جو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے جڑا ہوا ہے۔ حکومت اور سیاسی اداروں کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اگر مغربی تہذیب سے کچھ سیکھنا ہے تو اس کے غلبے اور برتری کو بھی ماننا ہوگا۔ یورپی زبانوں اور مغربی تعلیمی اداروں سے گریز ممکن نہیں۔ جب تک مسلمان مغربی ماڈل کو واضح طور پر اور صدق دل سے قبول نہیں کریں گے وہ نہ تو ٹیکنالوجی حاصل کرسکتے ہیں اور نہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہوسکتے ہیں۔

مسلمانان عالم کے لئے ایسا درشت اور توہین آمیز لب و لہجہ اختیار کرنے کی ضرورت اہل مغرب کو اس لئے پیش آتی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات ساڑھے پانچ سو سال کے دوران میں شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ایسے مریض کی سی ہو کے رہ گئی ہے جس پر اب کوئی میڈیسن اثر نہیں کرتی...... دنیا جہان سے بیزار' افیونی طبیعت' کاہل' سست الوجود' اپنے حال میں مست' اپنی تقدیر پر شاکر' جو ہوتا ہے ہوکر رہے گا' وحدت الوجود (اور تقدیر کا) ایسا قائل کہ اپنے ارادے سے پلک جھپکنے کو بھی گناہ خیال کرے۔ مصنف اپنی مغربی تہذیب کا عرصہ زوال ایک صدی بتاتا ہے' جبکہ مسلم نفسیات کو زوال پذیری کے جھٹکے سہتے سہتے ساڑھے پانچ سو سال ہوگئے ہیں۔

وہ کون سی حد فاصل ہے جہاں سے امت مسلمہ کا زوال اور ان کے مدمقابل مغربی طاقتوں کا عروج شروع ہوا؟ تواریخ میں وہ سال فتح قسطنطنیہ کا سال یعنی 1453ء لکھا ہے۔ کیوں لکھا' اس کا جواب اس مضمون کے مطالب سے باہر ہے۔ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ اسی سال سے جدیدیت کا آغاز ہوا تھا۔ مفتوح قوم نے اپنی شکست کے اسباب کا صحیح تجزیہ کیا۔ غیر ضروری مابعد الطبیعیات' غلط مذہب اور پاپائیت کے سخت گیر احتسابی نظام کو مسترد کرکے عقلیت اور تجربیت کا راستہ اختیار کیا۔ پہلے احیائے علوم اور اس کے کچھ عرصہ بعد اصلاح مذہب کی کامیاب تحریکوں نے اس کے راستے کو آسان' منزل کو واضح اور ترقی کی رفتار کو تیز کردیا۔ چارسو سال کی مسلسل اور سخت جانفشانی کے بعد بیسویں صدی مکمل طور پر اہل مغرب کی صدی تھی۔ ذہن و نفس کی دنیا پر وہ سگمنڈ فرائیڈ کے ذریعے حیاتیات کے شعبے میں ڈارون کی وساطت سے اور طبعی کائنات پر وہ آئن سٹائن کے بدست' بلاشرکت غیرے حکمرانی کرتے رہے۔ جوہری توانائی کا انکشاف جس کے نتیجے میں ایٹم بم' ٹیلی ویژن' مواصلاتی سیارے' چاند کی تسخیر' مریخ کی مٹی کھرچ کر کیمیائی تجزیے کے لئے زمین کی لیبارٹری میں لانا' کمپیوٹر اور لاتعداد گھریلو و دفتری اشیا کی محیر العقول ایجادات صرف اور صرف اہل مغرب کی تحقیق و محنت کے ثمرات ہیں جن سے مسلمانان عالم اپنے اسلاف کی میراث سمجھ کر استفادہ کررہے ہیں اور بیچاری مسلم نفسیات حیرت کدے کے ایک گوشے میں کھڑی حیران و پریشان ہمہ

وقت گنگناتی رہتی ہے۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ادھر مغرب میں تو سیکولرازم کی اسکرین کے پیچھے عیسائیت صیہونیت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر روز افزوں ترقی کے مراحل یکے بعد دیگرے طے کرتی گئی اور ادھر مسلم نفسیات حیرتی بن کر اپنے باطن کے نہاں خانے میں خلوت نشین ہوگئی۔ ترک دنیا میں عافیت جانی' دین کو دنیا سے الگ کر کے موت کو زندگی پر فائق کر لیا۔ خلافت راشدہ اور خلافت امیہ تو دور کی بات ہے خلافت عباسیہ کو بھی ختم ہوئے دو سو برس ہو چکے تھے۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد عالم اسلام میں بڑی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئیں لیکن کسی ایک سلطنت نے بھی بیچاری مسلم نفسیات کا درد نہ جانا' خلافت عثمانیہ' ایرانی صفوی سلطنت' ہندوستان میں مغلیہ سلطنت' ایسا نہیں تھا کہ مسلمان سلاطین' بادشاہ اور شہنشاہ مغرب میں ترقی علوم سے بے خبر تھے۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ مسلمان بادشاہوں کو وینس اور جنیوا کے باشندوں کی ترقی علوم اور عروج دنیا کا علم نہ ہو جس کی بدولت انہوں نے اسلحہ سازی میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ مسلمان سلاطین پرتگالیوں کی اس مہارت سے بھی ناواقف نہ تھے جو انہوں نے جہازرانی اور جہازسازی میں حاصل کی تھی اور جس کی وجہ سے وہ دنیا کے تمام سمندروں پر حکمرانی کر رہے تھے' ان میں وہ سمندر بھی شامل تھے جو حج کے راستے میں پڑتے تھے۔ ہاں ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مسلمان بادشاہوں نے عالیشان مقبرے بنوائے' بڑے پختہ قلعے تعمیر کروائے' عظیم الشان مسجدیں بنوائیں' مسجدوں سے متصل مدرسے اور کتب خانے کھولے اور ان کے سارے اخراجات اپنی گرہ سے پورے کئے۔ لیکن خبردار اوکسفرڈ کی طرف نہ دیکھنا' کیمبرج یونیورسٹی پر نگاہ کی تو کفر و الحاد کی ناپاک روشنی سے تم اندھے ہو جاؤ گے' پیرس یونیورسٹی کی طرف نہ دیکھو' جامعۃ الازہر میں جاؤ' جامعہ زیتون میں جاؤ' چنانچہ مسلم نفسیات کی پیچیدہ ڈوری میں ایک اور گرہ لگ گئی۔ تحقیق و تخلیق کے دروازے اس پر بند ہو گئے۔ معقولات کی کھڑکی سے آئی ہوئی روشنی کفر قرار پائی اور منقولات اور تقلید کی دہلیز پر کھیلتے رہنا مسلم نفسیات کا مقدر ٹھہرا۔ ساڑھے پانچ سو سال تک مسلسل حالت پر قناعت کئے رہنا یہ مسلم نفسیات ہی کا حوصلہ ہے' مسلم نفسیات کس قدر سخت جان ہے!

مسلم نفسیات اگر مغرب کو اپنا حریف خیال کرتی ہے تو مغرب کا حال اس عرصے میں یہ رہا کہ وہ تحریک احیائے علوم' اس کے بعد اصلاح مذہب' اس کے بعد عظیم انقلاب' پھر انقلاب فرانس' پھر انقلاب صنعت' پھر انقلاب روس' پھر پہلی جنگ عظیم' پھر خلافت عثمانیہ کے خاتمے' پھر دوسری جنگ عظیم کے انقلابات سے گزرتا ہوا' پہلے برٹش ایمپائر کی صورت میں اور اب امریکی استعمار کی صورت میں' پنجۂ یہود بن کر مسلم معیشت' مسلم تہذیب اور مسلم وجود کی گردن پر اپنے دانت گاڑے ہوئے ہے۔ اس نے مسلم ملکوں کی پوری پوری آبادی اور ان کے پورے پورے وسائل و ذرائع پر قابض و متصرف رہ کر اور انہیں بھاری شرح پر قرضے اور اقتصادی امداد دے دے کر ان کی روح

اور نفسیات کو گروی رکھ لیا ہے۔

صدیوں سے موجود احساس کمتری پر مغروض کا سا احساس لاچارگی بھی مسلم نفسیات کی جڑوں میں بیٹھ گیا ہے۔ جب آدمی کسی بڑی بیماری میں مبتلا ہو کر ڈھے جاتا ہے تو اسے کئی طرح کی چھوٹی چھوٹی بیماریاں بھی چمٹ جاتی ہیں۔ ڈپریشن اور ٹینشن اور جانے کیا کیا الا بلا۔ حصول آزادی بیماریوں کو جھٹک دینے کا اچھا موقع تھا۔ لیکن مسلم ملکوں میں فوجی یا سول حکمرانوں نے مغرب کے گماشتوں کا کردار ادا کیا۔ انہی کی طرح عوام کے حقوق غصب کئے' بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کو پروان چڑھایا' عوام جنہوں نے آزادی کی تحریکوں میں قربانیاں دی تھیں' یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ہمارے حکمرانوں سے انگریز یا فرنچ یا ڈچ ہی اچھے تھے کہ کم از کم ان کے گورنروں کے ہاں شرفا کی بیٹیاں تو برآمد نہیں ہوتی تھیں۔ اپنے گھر کے اندرونی مسائل سے مسلم نفسیات میں اجتماعی شیزوفرینا کے آثار پیدا ہو گئے۔ مسلم معاشروں کو چپ لگ گئی اور قوت مزاحمت ٹھٹھر کر رہ گئی۔ حکمران ٹولے ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں وہ خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے ہیں۔

مسلم نفسیات کسی قدر دزدیدہ بھی واقع ہوئی ہے۔ تہذیبوں کے تصادم میں اس خوف سے کہ مقابل تہذیب کو ہماری خامیاں اور کمزوریاں معلوم نہ ہونے پائیں' مسلمان سچ کو چھپاتے اور جھوٹ کو نمایاں کرتے ہیں اور اس مقصد سے اپنی تاریخ کے حقائق کو مسخ کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ فلاں بادشاہ پنج وقتہ نمازی تھا' اسے تو اچھالیں گے اور وہ اپنے باپ بھائیوں کا قاتل تھا اس کی پردہ پوشی کریں گے۔ اسی لئے مسلمان تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے گھبرانے کے عادی ہو گئے ہیں لیکن یہ عادت انہیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے کیونکہ ان کی نفسیات کی گہرائیوں میں جا کر گھر کر لیتی ہے اور مسلمانوں کی قوت عمل کو گھن کی طرح چاٹتی رہتی ہے۔ اپنی ہی پیدا کردہ خامیوں اور غلطیوں کو دوسروں کی سازش قرار دینے کا عمل اسی پردہ پوشی کی عادت سے پیدا ہوتا ہے۔

ان تمام چھوٹی بڑی بیماریوں نے جمع ہو کر مسلم نفسیات کو دوسری عمل پسند تہذیبوں کے مقابلے میں ڈے ڈریمر (دن میں خواب دیکھنے والا) بنا دیا ہے۔ مسلمان ہر وقت ایک خواب کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ مستقبل قریب میں خلافت راشدہ کے نمونے پر اسلامی نظام کے قیام کی تمنا' ناآسودہ آرزو' اسی نوعیت کا خواب ہر وقت' ہر لمحے مسلم نفسیات کے اندر پیدا ہوتا رہتا ہے' ٹوٹتا رہتا ہے پیدا ہوتا رہتا ہے' ٹوٹتا رہتا ہے اور یوں مسلم وجود اور مسلم ذہانت شق ہو کر رہ گئی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا مسلم نفسیات دوسری تہذیبوں سے کشمکش کرتے وقت ہمیشہ کے لئے کچلی جائے گی؟ کیا مریض کے بحال ہونے کی کوئی امید ہے؟ ہاں! امید ہی نہیں' پورا یقین ہے۔ مسلم نفسیات کے اجتماعی لاشعور کی آخری گہرائیوں کے رگ ریشے میں وہ ایک چیز جو پیوست ہے اور جس نے اسے دوسری تہذیبوں سے منفرد و ممتاز اور زیادہ طاقتور بنا رکھا ہے' وہ ہے اس کا عقیدہ'

مسلمانوں کے عقیدے کے حوالے سے مجھے ابن رشد کا ایک قول یاد آ رہا ہے۔ اس نے کہا تھا۔ مسلمانوں کا وجود علم الحقائق حواس، مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر نہیں، عقیدے کی بنیاد پر استوار ہے۔ ایک حقیقت وہ ہے جس کا علم عقل کے ذریعے فلسفیوں اور سائنس دانوں کو حاصل ہوتا ہے اور دوسری حقیقت وہ ہے کہ جس کا علم وحی کے ذریعے انبیاء کو اور (اس وحی پر ایمان کے حوالے سے) عقیدے کے ذریعے عام انسانوں کو حاصل ہے۔

ابن رشد نے کس تدبر سے وحی الٰہی کو عقیدے کی اساس پر عام انسانوں تک پہنچا دیا ہے۔ یہ عقیدہ کہ لاریب فیہ، یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں، یہ کہ محمد آخری رسول ہیں، یہ کہ بالآخر انسان کے اعمال کا حساب کتاب ضرور ہوگا، توحید، رسالت اور آخرت پر مبنی یہ عقیدہ، یہ مرد بیمار کو بحال کرنے کا ٹانک ہے، اک نسخۂ اکسیر ہے، جس دن بھی اسے استعمال کرے گا وہ اٹھ کھڑا ہوگا۔

اپنے اس عقیدے کی بنیاد پر پہلے بھی مسلمان بار بار نشاۃ اسلامیہ یا احیائے اسلام کی خاطر اٹھے، بڑے بڑے مجددین اور مصلحین ان کی راہنمائی کے لئے دستیاب رہے، لیکن کبھی کوئی تحریک اس لئے کامیاب نہ ہوسکی کہ انہوں نے اپنے عقیدے کی طاقت کو علم کی طاقت سے آمیز نہیں کیا۔

مستقبل میں احیائے اسلام کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک عقیدے کو علم کی طاقت سے ہم آہنگ نہ کیا جائے۔ عقیدہ مقصد ہے اور علم ذریعہ۔ عقیدہ ایمان ہے، علم عمل ہے ایک وسیلہ ہے، ایک ہتھیار ہے۔ مغرب میں جتنے بھی غیر مسلم اسلام قبول کر رہے ہیں وہ اسلام کے عقیدے کی بنا پر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے علم کی بنا پر نہیں۔ اگر نشاۃ ثانیہ لانا مقصود مومن ہے تو اس کے لئے پہلے مغرب کی طرح مسلم دنیا کو تحریک احیائے علوم کی دشواریوں سے گزرنا پڑے گا، جو برس دو برس کی نہیں، دو چار صدیوں کی کہانی ہوگی۔

لیکن خبردار ہوشیار، مغرب کی تحریک احیائے علوم جو اسے معراج کمال تک لے آئی ہے، آج اس کے زوال کی نشاندہی بھی کر رہی ہے۔ وہ غلط مذہب کے خلاف شدید ردعمل کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے وحی الٰہی کو نظرانداز کیا اور عقل محض کو اپنی سارے علوم کی بنیاد قرار دیا۔ چنانچہ آج کے مغربی دانشور برملا اعتراف کر رہے ہیں کہ مغربی تہذیب اخلاقی اقدار سے ناآشنا ہو چکی ہے۔ وہ مادہ پرستی، خود پرستی اور بے ضمیری کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر کسی مسیحا کی تلاش میں ہے جو ملتا ہے تو اسلام کے عقائد میں۔

آج مسلم نفسیات کو، مسلم امہ کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے احیائے علوم کی تحریک کا برپا ہونا، جو وحی الٰہی اور عقل کی آمیزش سے منظّم کی جائے۔ اس کے لئے ہمیں عقل کے بارے میں اپنے رویوں میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی جو صدیوں سے مسلم نفسیات کی جڑوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

آج کے سنگین حالات کا چیلنج قبول کرنے کے

لئے ہمیں اپنی راہیں اپنے عقائد کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے پیش آمدہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنی عقل و دانائی سے خود تراشنا ہوں گی۔ مرد بیمار کو جلد بستر مرگ سے اٹھانے کے لئے عقیدے کا نسخہ اکسیر پلانا ہوگا۔ علوم طبعی کی بیساکھیاں ان کے دونوں ہاتھوں میں تھما کر تجدید و احیائے اسلام کی منزل کی طرف جانے والا روشن راستہ دکھلا کر' تہذیبوں کے میدان کارزار میں فکری و علمی اجتہاد کی قوت سے جہادی جذبے سے کام لینا ہوگا۔ 2015ء تک سب سے بڑی اسلامی مملکت کا شیرازہ بکھرنے کی پیش گوئی کرنے والے امریکی تھنک ٹینک کا جواب دینے کے لئے ایک اسلامی و پاکستانی ''تھنک ٹینک'' قائم کرنا ہوگا۔

جارج بش کے سینے سے نکلی ہوئی زہرناک گولی ''کروسیڈ'' مسلم نفسیات کے سینے میں گڑ گئی ہے۔ اسے نکالنے کی ذمہ داری مسلم ماہرین نفسیات ہی پر عائد ہوتی ہے۔ ہفتے میں ایک شام مسلم امہ کو پیش آمدہ مسائل پر گفتگو کیجئے۔ بحث مباحثہ کیجئے' مضامین پڑھئے۔ تحقیقی مقالات لکھئے اور لکھوائیے۔ حریفوں کو مسکت اور مدلل جواب دیجئے۔ آج سے سو سال پہلے جب ہم افرنگ کی غلامی' صرف لامی میں آئے تھے تو حالی بلبلا اٹھا تھا۔

اے خاصۂ خاصان رُسل' وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

لیکن آج رسولؐ کی امت پر جو وقت آن پڑا ہے' وہ حالی کے وقتوں سے کہیں زیادہ سخت' شدید اور بھاری ہے اور یقیناً یہ وقت دعا نہیں' وقت عمل ہے۔

(بشکریہ ''پیغام آشنا'')

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

فکرِ پرویز۔۔ایک مختصر ترین تاثر

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے' یہ کوئی تیس بتیس سال پرانی بات ہے' یعنی یہی کوئی آٹھ دس برس کی عمر میں ہماری سماعت سے یہ فقرہ ٹکرایا تھا' ''لو جی! مسلمانوں میں پرویزیوں کے نام سے ایک نیا فرقہ ایجاد ہو گیا ہے۔'' یہ الفاظ ہمارے ایک پیر پرست مہربان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ صاحب پاکپتن میں ہمارے میزبان تھے۔ یہ تھا ''فکرِ پرویز'' سے ہمارا پہلا تعارف۔ عہدِ طفولیت میں بھلا ہمیں اس ''فرقے'' سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی' تاہم تجسس کا پہلا بیج اسی دن بویا گیا۔ کئی سال گزر گئے' لیکن نہ جانے کیوں متذکرہ نیم طنزیہ تعارفی جملہ ہمیں بھولا نہیں' تا آنکہ ہمیں دسویں جماعت میں ایک بزرگ استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ رحیم بھٹہ صاحب اس ہستی کا اسم گرامی ہے۔ جواب کافی معمر ہو چکے ہیں۔ ''جماعت احمدیہ'' کے برگزیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں رحیم صاحب کے بے حد احترام کے باوجود ان کے مذہبی اعتقادات سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے متعلق اور کیا کہیں بس غالبؔ کا یہ شعر عرض کر سکتے ہیں ۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اس عاجز پر رحیم صاحب کے لاتعداد احسانات میں سے سرفہرست یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ''فکرِ پرویز'' سے باقاعدہ متعارف کروایا۔ ان کی وساطت سے ہی غلام احمد پرویز کی تصنیف ''قتلِ مرتد' ہمیں ملی۔ میٹرک کا سٹوڈنٹ ایک علمی کتاب سے جتنا استفادہ کر سکتا ہے' ہم نے بھی کیا۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ کم و بیش ربع صدی گزر جانے کے باوصف نہ صرف اس کتاب کے مندرجات ہمیں اچھی طرح یاد ہیں بلکہ اس حوالے سے پرویز صاحب کے مثبت نقطہ نظر نے مستقل ہمارے قلب و ذہن میں جگہ بنا لی۔ بعد میں ایسی کئی تقریریں اور تحریریں ہماری سماعتوں اور بصارتوں سے ٹکرائیں جن میں ارتداد کو جرم ثابت کرنے کے لئے بعض روایتی سوچ رکھنے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا' لیکن سچی بات ہے ان کی ایک بات بھی دل کو نہ لگی۔ اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق پرویز صاحب نے جو صراحت کی' وہ اتنی معقول ہے کہ اس کا ہر جواب پوچ ہے۔ بعض علمی مجالس میں ہم نے ''رسک'' لے کر اس باب میں بعض ثقہ علماء کرام سے براہ راست استفسارات کر کے بھی دیکھ لیا' لیکن جواباً ہمیں قابل رحم عجز کا مشاہدہ ہی کرنا پڑا اور ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ محض ایک

شخص کی معاندت اور غیر مستند تاریخ و روایات کی صنم پرستی نے انہیں کیسے دن دکھا دیئے ہیں کہ کائنات کی پاکیزہ ترین شخصیت ﷺ کا تقدس بھی انہیں عزیز نہیں رہا کہ بلا جھجک زبان پر ایسی ناروا باتیں لے آتے ہیں کہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے ایک عام اور گنہگار مسلمان کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں راستی کا راستہ دکھائے۔

قصہ مختصر علم و ادب سے وابستگی جیسے جیسے پختگی کے مراحل طے کرتی گئی غلام احمد پرویز مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ جاری رہا۔ اگرچہ اس دوران میں کئی پڑاؤ آئے' طویل وقفے بھی آئے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

1983-85ء کا عرصہ بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے ایف سی کالج میں گزرا۔ ہوسٹل میں مقیم رہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ 25/B گلبرگ 2۔ پرویز صاحب کی رہائش ہے۔ یہ بھی خبر تھی کہ آپ ہر ہفتے درس قرآن دیتے ہیں۔ ''ثواب طاعت و زہد'' جاننے کے علی الرغم جانے کیوں طبیعت ادھر نہیں آئی۔ تعلق خاطر جانے کس کس نوع کے دار و رسن کی اور لئے پھرا بس ادھر رخ نہ ہو سکا ''ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا''۔ حقیقت یہ ہے سب سے بڑی نعمت' نعمت کی موجودگی کا احساس ہے اور ہمیں بھی اس نعمت کا احساس اس دن ہوا جب یہ نعمت روئے ارض پر موجود نہ رہی۔ ایک دم قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''چندراوتی'' کا پہلا فقرہ یاد آیا ہے:

''جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا......''۔

صاحبو! ہم وہ تاریخی دن کیسے بھول سکتے ہیں' جی ہاں 25 فروری 1985ء (1) ہم اپنے کزن سے ملنے ایف۔سی کالج سے ریواز گارڈن گئے۔ واضح رہے ان دنوں ہمارے پاس ایگل کی بائیسکل ہوا کرتی تھی اور پورا لاہور اس کے دو پہیوں کی گردش میں سمٹنے پر مجبور بلکہ ''مجبورِ محض'' تھا۔ وہیں ریواز گارڈن میں اخبار کے پہلے صفحے پر ہماری نظر پڑی' پرویز صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر نے بےکل کر دیا۔ ان کی موت سے زیادہ افسوس ہمیں یہ لاحق ہو گیا کہ اتنا قریب ہونے کے باوجود ان سے مل نہیں سکے' انہیں سن نہیں سکے' ان کی زیارت نہیں کر سکے۔ اسی تاسف نے جسم و جاں میں ایک عجیب سی توانائی بھر دی' اپنی سائیکل اٹھائی' ریواز گارڈن سے سیدھے 25/B گلبرگ پہنچے۔ سفر آخرت کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ پرویز صاحب ایک چارپائی پر پڑے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان سے محبت کرنے والے ان گنت احباب اردگرد موجود تھے' کہیں آنسو رواں ہیں' کہیں دبی دبی سسکیاں تو کہیں قدرے بلند آواز میں گریہ۔ پرویز صاحب کے بھائی (مرحوم) ڈاکٹر عارف بٹالوی سب کو تسلیاں بھی دیتے جاتے تھے اور خود روتے بھی جا رہے تھے۔ ہم نے بار بار جی بھر کے اس عظیم انسان کو دیکھا جس نے ایک عہد کو متاثر کیا تھا۔ برآمدے میں ایک عمر رسیدہ شخص اونچی آواز میں اپنے محسن پرویز صاحب کو یاد کر رہا تھا۔ اس کا نام مرزا سلطان بیگ (نظام دین) تھا۔ جنازہ روانہ ہوا۔ ہم بھی اس جلوس میں

1۔ غلام احمد پرویز نے 24 فروری 1985ء کو وفات پائی۔ تدفین 25 فروری کو ہوئی۔ (ج۔ا۔ع)۔

شامل رہے۔ منی مارکیٹ کی گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ تدفین کا مرحلہ آیا تو بھی ہم موجود رہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ان کے کسی عزیز نے دور سے (غالباً کراچی سے) پہنچنا تھا' چنانچہ تدفین کے مرحلے کو کچھ مؤخر کر دیا گیا کہ فلائٹ کا انتظار کیا جانے لگا۔ اس دوران میں کہ ان کی آخری آرامگاہ تیار ہو چکی تھی' پاس چارپائی پر ان کی میت پڑی تھی۔ قریب ہی جناب حنیف رامے نے اپنی چادر بچھا دی۔ ہم لوگ ان کے کہنے پر وہاں بیٹھ گئے۔ ان دنوں رامے صاحب کا ایک مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا' بے حد متنازع ہونے کی وجہ سے ہر حلقے میں موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ اس خاکسار نے اس مضمون کی بابت رامے صاحب سے جو دو ایک سوالات پوچھے تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ بڑی گرما گرم باتیں ہوئیں۔ واپس آ کر اس گفتگو کے تضمنات پر مبنی اور پرویز صاحب کے آخری سفر کی روداد' جو دس بارہ صفحات پر مشتمل تھی' ہم نے رحیم صاحب کو خط کی صورت میں بھیجی تھی' کیا عجب ان کے پاس یہ مفصل خط محفوظ ہو۔

بہرنوع وقت کا دریا اپنے غیر متعین تعینات کے ساتھ بہتا رہا۔ ہم ''طلوع اسلام'' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آدھ کنونشن میں شریک ہونے کی سعادت بھی ملی۔ کبھی کبھار پرویز صاحب کی کسی کتاب میں سے بھی گزرنے کا موقع ملتا رہا۔ ''فکر پرویز'' سے تعلق رکھنے والے دوستوں' اسلم صابر صاحب' محمود الحسن صاحب' ڈاکٹر اسلم نوید صاحب اور دیگر منسلکین سے رابطے رہے' مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا' ذہنی افق پھیلتا رہا۔ لیکن حق یہ ہے کہ پرویز کو پڑھنے اور سمجھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا تھا۔ اب سے کوئی تین سال قبل کی بات ہے کہ یہ عاجز بسلسلہ ملازمت ساہیوال میں مقیم تھا۔ وضاحت کر دیں کہ ہمارا تعلق شعبہ تدریس سے ہے۔ کوئی 15/16 سال ہو گئے ہیں' مختلف کالجوں میں پڑھاتے ہوئے۔ 2001ء میں جب ڈسٹرکٹ گورنمنٹس کا ڈول ڈالا گیا تو ہماری رضا معلوم کیئے بغیر ''جبراً'' ہمیں کلاس روم سے اٹھا کر آفس میں بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے عامیوں کی نگاہ میں ''ڈائریکٹر کالجز'' ہونا عزت کی بات ہو پر ہمیں تو یہ سراسر قید بامشقت کے مشابہ عمل محسوس ہوا۔ لہٰذا دو اڑھائی سال مسلسل سفارشیں ڈھونڈتے رہے کہ کوئی ''رجل غیب'' ہمیں اس جھنجٹ سے نجات دلا دے' ہم باز آئے اس ''ایجوکیشن افسری'' سے۔ سیدھی سی بات ہے ہم تو انہیں لفظ و حرف ہی ماننے کو تیار نہیں جو لٹریچر (علم و ادب) سے واسطہ نہ رکھتے ہوں اور یہاں تو اعداد تھے' ہندسے تھے' لایعنی میٹنگز تھیں' انکوائریاں تھیں ٹیکنیکل انسپیکشنز تھیں' فزیبلٹی رپورٹس تھیں' Expenditure State Ments تھیں' آڈٹ تھے' جی حضوری کی ایک زنجیر تھی۔ دستور یہی تھا کہ اوپر والوں کی ہر نامعقول بات ہنسی خوشی سہو اور نیچے والوں پر خوب خوب رعب گانٹھو۔ کیا عرض کریں اس افسری لائن میں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں' چنانچہ اب بھی یہ گنگناتے رہتے ہیں' ''جنہیں ہم بھولنا چاہیں وہ ''افسر'' یاد آتے ہیں۔''

خیر وہ جسے Good out of Evil کہتے ہیں۔ اس کی رو سے مذکورہ اذیت بلکہ ''شر'' میں سے ہمیں بھی خیر کے کچھ پہلو ضرور ملے۔ میر دردؔ نے کیا عمدہ شعر کہا

ہے ؎

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر
سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

یہ درست کہ لمحۂ موجود میں ہم آزاد ہیں' اس ''سمناک'' ماحول سے ہمیں چھٹکارا مل چکا ہے لیکن یہ بہت بڑا سچ ہے کہ اگر اس Misery کا ہمیں ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوا ہوتا' زندگی کی سفاک جہتوں کے ہم خود شاہد نہ ہوتے تو ممکن ہے پرویز صاحب کی تصانیف میں موجود ''زندگی کے زہر'' کو نوشِ جاں کرنے کی صلاحیت سے عاری رہتے۔ وہی بات ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی' نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صاحبو! آپ ذرا سوچئے وہ فرد جس نے چالیس برس مذہبی گھرانے' مذہبی معاشرے میں بتائے ہوں کیا وہ مذہب کے بغیر لقمہ بھی توڑ سکتا ہے؟ نہیں جناب یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اس فرد کے طرزِ احساس کی بُنت میں مذہب کا Fibre بنیادی تانے بانے کے طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر اتفاق سے کوئی ایسا واقعہ اس فرد کے ساتھ پیش آ جائے کہ اسے ''بدنصیبی'' سے اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو خالص معروضیات کی دھوپ میں کھینچنا پڑ جائے' غیر جانبدار ہو کر ان کا جائزہ لینا پڑ جائے' ہر خوش عقیدگی کو منہا کر کے ان کا تجزیہ کرنا پڑ جائے تو عین ممکن ہے نتائج کی بے رحم صورت دیکھ کر اس فرد کو ہارٹ اٹیک آ جائے اور وہ سچائی کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے ہی کوچ کر جائے۔

دوستو! یہ خاکسار عربی' فارسی' انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم پرویز کو اپنا محسن کیوں نہ قرار دے کہ ہمیں موت کی وادی سے بچانے والا یہ واحد بندہ ہے۔ بات جسمانی موت کی نہیں' مسئلہ ذہنی موت کا ہے۔ ہمیں پرویز نے ذہنی موت سے بچایا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت سے قبل جسمانی طور پر مر جائے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت کے بعد جسمانی سطح پر زندہ رہے۔ کوئی اس عذاب کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

دفتری زندگی کے دوران ایک مرتبہ نہیں ان گنت مرتبہ ایسا ہوا کہ زندگی بغیر کسی آراستگی کے' بغیر کسی ورق کے' ہر Drapery سے مکمل بے نیاز سامنے آتی رہی۔ ایسے لمحے بار بار آئے کہ غیبی قوتوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی' لیکن یہ کیا کہ Stretch the Truth والا فارمولا بلکہ مجرب نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا' پر ہوا کچھ نہیں' جو زمینی حقائق تھے' وہ جوں کے توں رہے' جو سچ تھا' وہ وہی رہا۔ اسباب کا جادو ہی سر چڑھ کے بولا' علت اور معلول کے بیچ رشتے کی توانائی اس شدت سے ابھر کر سامنے آئی کہ .I was Stumped

طاقچے کے خطوط پڑھتے پڑھاتے عمر بیت گئی تھی' کچھ پلے نہیں پڑا تھا' یہ پرویز ہی تھا جس نے اقبال کے یہ شعر یوں سمجھائے کہ ہمیں ''کلیاتِ اقبال'' میں انہیں اس نیت سے تلاش کرنا پڑا' کہیں یہ اشعار پرویز نے خود گھڑ کر تو اقبال سے منسوب نہیں کر دیئے' آپ بھی سنئے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جی ہاں صاحبو! یہ پرویز صاحب کی ''کتاب التقدیر'' تھی جس کے بالاستعیاب مطالعہ نے وہ گرہ کھول دی جو ذہن میں بیس برس سے پڑی ہوئی تھی' کس کس نکتہ ور کی بارگاہ میں ناصیہ فرسائی نہیں کی تھی ہر کہیں سے ایک سا ہی جواب موصول ہوا تھا۔ ''نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی''۔ اس معرکہ آرا کتاب کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے تو اپنے اللہ سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی کہ یارب الارباب! اس عاصی کو معاف کر دے کہ اب تک اپنا ہر جرم تیرے کھاتے میں ڈالتا آیا ہوں۔ تیرے قادر ہونے کا مفہوم اصفیاء و علماء نے مجھے یہی سمجھایا تھا کہ گناہ کی توفیق بھی تو دیتا ہے' نیکی کی سعادت بھی تو ہی بخشتا ہے۔ گمراہ بھی تو کرتا ہے' ہدایت کے جادے پر بھی تو ہی گامزن کرتا ہے۔ بندہ مجبور ہے' تیرے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے' مختاری کی تہمت سے مہتم ......لیکن یہ پرویز تھا جس نے قرآن کھول کر دکھایا کہ نہیں نہیں یہ پاک خدا پر الزام ہے' اس نے تو ہر انسان کو مکمل اختیار دیا ہوا ہے اور پھر اس نے وہ آیات ایک ایک کر کے سمجھائیں جن میں تضاد محسوس ہوتا تھا' جو خدا کو غیر عادل ثابت کرتی تھیں' بے انصاف بتاتی تھیں۔ بندے کو مجبور صورت میں پیش کرتی تھیں۔ جب سارے عقدے کھل گئے تو زبان اپنے آپ یہ تلاوت کرنے لگی: ؎

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں تھے

ضمناً پرویز صاحب نے ہی وضاحت کی' قرآن مجید کی کوئی آیت تو دور کی بات ہے' ایک نقطہ' شعشہ تک بھی منسوخ نہیں۔ ورنہ بڑے بڑے زہاد پانچ سات آیتوں کے سامنے دم بخود یہ اقرار کرتے پائے گئے: اے آیتو! تم پر تو عمل نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ یہ کریڈٹ اس پرویز کے کھاتے میں ہی لکھا جائے گا جسے سارے علماء صبح و شام کافر کہتے نہیں تھکتے۔ آپ یقین کیجئے مسئلہ تقدیر سمجھ میں آنے کے بعد اس عاجز کو وہی لذت محسوس ہوئی جو پوری تحقیق کے بعد کسی نومسلم کو قبول اسلام کی ملکوتی ساعت میں محسوس ہوتی ہوگی۔

غلام احمد پرویز کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ختم نبوت کا حقیقی مفہوم سمجھایا تفصیل پھر کبھی سہی' اجمالاً اتنا عرض ہے کہ احمدیوں کے ساتھ ہمارا بڑا وقت گزرا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو مجموعی طور پر اچھے کردار والے انسان پایا ہے' شرافت اور علم تقریباً ہر احمدی کے امتیازی اوصاف ہیں کہ ان کی جماعت منظّم ہے' تربیتی نظام مثالی ہے لیکن ان لوگوں کے اعتقادات ریت کی دیوار ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کیوں معروضی بنیادوں پر اپنا جائزہ نہیں لیتے؟ ہم اپنے طور پر اس کی دو وجوہ تلاش کر سکے ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے علماء نے اس جماعت کے خلاف نفرت کی ایسی فضا تیار کی ہے کہ یہ لوگ اپنے کمزور عقیدوں کے ساتھ اور زیادہ مضبوطی سے جڑ گئے ہیں۔ اگر انہیں پیار کے ساتھ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو آج نتائج یکسر مختلف ہوتے۔ دوسری بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ختم نبوت کے باب میں عام مسلمانوں کا قریب قریب وہی موقف ہے جو خود قادیانیوں کا ہے۔ جی ہاں ایک آنے والے کا عقیدہ مسلمانوں کی میراث ہے۔ ''ہم نے احمدی علماء VS علمائے اسلام'' کافی مناظرے سنے ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ عام سے احمدی

نے بھی اچھے بھلے عالم دین کو وہ عبارات دکھا کر لا جواب کر دیا جن میں غیر تشریعی نبوت کے اجرا کو ہمارے اکابرین نے تسلیم کیا ہے۔ اب یہ اکابرین عامی شامی نہیں' جید ہستیاں ہیں۔ اس نازک صورتحال میں علماء کرام اسی معروف تاویل کا سہارا لیتے ہیں کہ غیر تشریعی نبی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہے وہ چونکہ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں' آخری زمانے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے لئے تشریف لائیں گے۔ اس پر ذہین احمدی فوراً یوں گرفت کرتے ہیں۔ جناب! اصل چیز پھر ''ضرورت نبوت'' ہوئی۔ اگر تجدید و احیائے دین کے لئے پرانا نبی آ سکتا ہے تو نیا کیوں نہیں؟ اور پھر وہ نیا جو قرآن کو منسوخ کرنے والا نہ ہو' حضورﷺ کا امتی ہو۔ نیز ختم نبوت کے پھر معانی یہی ہوئے کہ حضورﷺ فضیلت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ نبی ہیں' آپﷺ کے بعد آپﷺ کی پیروی میں کوئی نبی مبعوث ہو جائے تو آپﷺ کی ختمیت مرتبی متاثر نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی آمد نو کے بعد متاثر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اور مسلم شریف کی احادیث کے مطابق ان پر وحی بھی اترے گی۔

دوستو! یہ جری شخص غلام احمد پرویز تھا جس نے قرآن کی رو سے توضیح کی' ختم نبوت کا مطلب ہے' حضورؐ ہر لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' پرانا نہ نیا۔ قرآن بار بار شہادت دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح وفات پا چکے ہیں جس طرح تمام انبیاء کرام رحلت فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اب کسی کی آمد کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ختم نبوت کا مطلب ''ضرورتِ نبوت'' کا خاتمہ ہے۔ اب ہدایت کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآن ہے' کوئی نئی وحی نہیں' حتیٰ کہ کسی مترادف نام و متبادل عنوان سے بھی اللہ کا کلام کسی بندے پر نازل نہیں ہوگا' کیونکہ اللہ کا کلام حجت ہوتا ہے' اب قرآن کے بعد جو اس حجت کو بیچ میں لائے گا' وہ امت کو نئی تقسیم سے دوچار کرے گا۔

ویسے جملہ معترضہ کے طور پر ذرا غور کیجئے کہ احمدیوں کا مسئلہ سلجھانا کتنا آسان تھا یہ لوگ وفات مسیحؑ کے پہلے ہی قائل ہیں۔ انہیں صرف خاتم النبین کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت تھی۔ انہیں بتایا جاتا کہ آیات روایات پر مقدم ہیں۔ جب آیات یہ اصولی فیصلہ دے رہی ہیں کہ نئی نبوت ممکن ہی نہیں تو آپ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیں' کسی اور طرف آپ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قول رسولؐ اور آیت ربانی میں تناقض ہو۔ جب اللہ کی کتاب کہہ رہی ہے حضورﷺ آخری نبی ہیں اور حضرت عیسیٰ وفات پا چکے ہیں تو پھر حضورﷺ کا نقطہ نظر اس سے ہٹ کر کیسے ہو سکتا ہے؟ نتیجہ معلوم! دیکھنے والی چیز یہ ہے کہ از سر نو جائزہ لیا جائے وہ فرامین جو حضورﷺ سے منسوب کئے جا رہے ہیں کیا وہ حضورﷺ کے ارشادات ہیں بھی یا نہیں؟ پرویز صاحب نے ہی قوم کو سمجھایا کہ حدیث رسولؐ رہنمائی کا بلا شبہ سرچشمہ ہے لیکن یہ طے ہونا از بس ناگزیر ہے کہ جسے حدیث رسولؐ کہا جا رہا ہے وہ حدیث رسولؐ ہے بھی یا نہیں؟ اور ساتھ ہی انہوں نے بہترین معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ جو قول قرآن کے مطابق ہے وہ قول رسولؐ ہے جو اس کے برعکس ہے وہ قول رسولؐ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تناظر میں پرویز کو

منکر حدیث کہنا سراسر نا انصافی ہے یا نہیں؟

غلام احمد پرویز کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ بھی کئی جلدوں کی کتاب میں لیا جا سکتا ہے۔ وقت آئے گا ان پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں تحقیقی مقالے لکھوائیں گی' تب امت مسلمہ کو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا شخص ان میں ہوگزرا ہے۔ ایسا شخص جس نے مدت العمر قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ایسا عدیم النظیر عشق کیا کہ واقعتاً دور دور تک مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پچاس سے زائد تصانیف چھوڑ کر جانے والے پرویز نے کہیں نہیں کہا کہ میرا کہا حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے عمر بھر عجز و انکسار کی ردا اوڑھے رکھی اور یہی کہتے رہے کہ میں قرآن کا معمولی طالب علم ہوں' جس طرح مجھے سمجھ آئی' خلوصِ نیت سے اسی طرح آگے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ اتنا اہم علمی خزینہ تخلیق کرنے والے پرویز نے کسی فرقے کی بنا نہیں رکھی۔ ان کی جماعت وہی تھی جو رسول کریم ﷺ کی جماعت تھی۔ ظاہر ہے اللہ کے نبی نے اپنی امت کو فرقوں میں بانٹنا تو درکنار دیکھنا بھی پسند نہیں کیا' اسی لئے پرویز صاحب نے بھی علامہ اقبال کی طرح بس ایک فکر دی ہے' اب اس نابغہ عصر کی فکر سے پوری کی پوری امت کتنا نور کشید کرتی ہے' یہ اس پر منحصر ہے۔ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک قرآن مجید کی شرح اپنی ضخیم تصانیف میں محفوظ کر دی ہے۔ جو ایک مربوط نظام فکر سے بجا طور پر معنون کی جا سکتی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ روشنی کے اس مینار سے استفادہ کرتے ہوئے اس قرآنی معاشرے کی تشکیل کریں جس میں مسرتیں ہوں' بدعنوانیاں نہ ہوں' محبتیں ہوں' خوشحالیاں ہوں' انسانی ذوات نشوونما پائیں' امن ہو' فساد نہ ہو' افلاس کا عذاب نہ ہو۔ سب اپنے سوہنے اللہ کے قوانین کی اطاعت کریں اور اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا ہی پیار کریں جتنا ان کی خوبصورت ذات سے ان کے دوستوں حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمر فاروق ؓ۔ حضرت عثمان غنی ؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر مخلص احباب رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

سنت وحدیث

(روزنامہ نوائے وقت میں ایک مستقل کالم ''نورِبصیرت'' کے نام سے چھپتا ہے جس میں میاں عبدالرشید کی تحریریں بار بار چھپتی رہتی ہیں۔ ''حدیث وسنت'' کے عنوان سے ایک کالم ۸ مارچ ۲۰۰۰ء کے نوائے وقت میں دوسری تیسری بار شائع ہوا تو محترم علی محمد چدھڑ صاحب نے اس پر ایک مضمون ارسال کیا تھا۔ اب ۷ فروری ۲۰۰۵ء کو وہی مضمون پھر اس کالم کی زینت بن گیا ہے تو علی محمد چدھڑ صاحب کا مضمون بھی دوبارہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

روزنامہ ''نوائے وقت'' مورخہ 8-3-2000 کے ایک مستقل کالم ''نوربصیرت'' سے لیا گیا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ ''حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کے جارہا ہوں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب اور دوسری اپنی سنت۔ اگر انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ سنت رسول مقبولؐ قرآن پاک ہی کی عملی تفسیر ہے۔ اگر سنت کو نظرانداز کر دیا جائے تو قرآن پاک کی من مانی تفسیر کرنے کا راستہ کھل جائے گا۔''

اسی حدیث کو مولانا شبلی نعمانی نے اپنی سیرت النبی میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے ''میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے وہ کیا چیز ہے۔ کتاب اللہ''۔ یہاں سنت کا ذکر نہیں۔ حجتہ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں پیش کیا جانے والا فرمان رسول ﷺ اس طرح کتنا متضاد ہو گیا ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ دونوں صورتیں درست ہیں۔ نہیں! صحیح جواب ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ ہے صرف کتاب اللہ۔ سنت والی بات کو اکثر علماء حدیث نے بعد کا اضافہ قرار دیا ہے۔ جس کی تائید چند دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد (جنہیں امام الہند بھی کہا گیا ہے) اپنی مشہور تصنیف ''انسانیت موت کے دروازے پر'' میں لکھتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا ''اے لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے یہ ہے اللہ کی کتاب' قرآن''۔ جناب نعیم صدیقی اپنی کتاب ''محسن انسانیت'' میں تحریر کرتے ہیں کہ خطبہ عرفات میں حضور ﷺ نے فرمایا ''میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جارہا ہوں کہ جب تک اس پر کاربند رہو گے کبھی راہ راست سے نہ ہٹو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب (صفحہ 587)۔ علامہ غلام احمد پرویز کی مشہور زمانہ کتاب ''معراج انسانیت'' میں لکھا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''میں تم میں ایک

چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے وہ چیز کیا ہے کتاب اللہ (صفحہ 393)۔ مشکوٰۃ شریف جلد اول' ص 565 میں دیکھا جا سکتا ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا ''میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ جب تک اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے وہ اللہ کی کتاب ہے''۔ تاریخ کی ایک اور کتاب میں لکھا ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا ''میں نے تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑی ہے جس کو اگر تم مضبوط پکڑو گے تو میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے۔ یاد رکھو وہ قرآن ہے۔ (تاریخ الامت علامہ اسلم جیراجپوری' جلد اول' ص 185)۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ کا وارث امت مسلمہ کو بنایا ہے تاکہ انسانی معاشرہ کو اس کی تعلیم کے مطابق متشکل کیا جائے 35:32۔ یہاں بھی حضورﷺ نے ہمارے لئے بطور ورثہ جو چیز چھوڑی ہے وہ کتاب اللہ ہی ہے۔ یہ ایک عام عقل وفہم کی بات ہے کہ کوئی کام یا ضابطہ اگر مکمل ہو جائے تو اس میں کسی کمی۔ اضافہ یا ردوبدل کی گنجائش نہیں رہتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اور تیرے رب کی باتیں صدق وعدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں کوئی نہیں بدل سکتا اور وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ 6:116۔ یعنی خدا کا ضابطہ قوانین (قرآن) مکمل ایسا کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں اور محکم ایسا کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ یہ اس خدا کا ضابطہ قوانین ہے جو سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ انسانی راہنمائی کے لئے جو کچھ دیا جانا ضروری تھا اس میں سے (معاذ اللہ) کوئی بات لاعلمی کی بنا پر رہ گئی ہو یا وہ بنی نوع انسان کے لئے کافی نہ رہی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ سورہ العنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے ''ان سے کہو کہ کیا تمہارے لئے کافی نہیں کہ خدا نے میری وساطت سے تمہاری طرف اس قسم کا ضابطہ زندگی بھیجا ہے'' 29:51۔ معلوم ہوتا ہے اسی آیت مقدسہ کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے بھی فرمایا تھا ''حسبنا کتاب اللہ''، یعنی ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

محولہ بالا وضاحتوں سے جو نتیجہ سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ حضو نبی کریمﷺ نے ہماری راہنمائی کے لئے جو چیز چھوڑی ہے وہ صرف کتاب اللہ ہے۔ جو کہ مکمل بھی ہے غیر متبدل بھی ہے اور انسانی راہنمائی کے لئے کافی بھی۔ حشر کے روز بطور شکایت ہمارے نبی کریمﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کریں گے کہ اے میرے رب! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے اگر رسولﷺ نے کتاب اللہ کے ساتھ اپنی سنت بھی قوم کے حوالے کی ہوتی تو سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا جاتا۔ لیکن حضورﷺ نے شکایت میں سنت کا نام تک نہیں لیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے۔ مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں۔ اسلام میں ایک خدا' ایک رسول اور ایک ضابطہ فلہٰذا ایک امت کا اصول ضرب المثل بن چکا ہے۔ جب تک یہ اصول قائم رہا ہماری وحدت بھی قائم رہی۔ جب وحدت متزلزل ہوئی سب کچھ انتشار کا شکار ہو گیا۔ ایسا کیوں نہ ہو جب قرآن ہمارے لئے کافی نہ رہے اور ہم سنت کے نام پر مختلف روایات پر بھروسہ کرنے لگ جائیں تو اس سے ایک تو دین میں دو یا دو سے زائد ضابطوں کا تاثر پیدا ہو گا' دوسرے یہ بھی اخذ ہو گا کہ قرآن اور سنت دو مختلف چیزیں ہیں جو کہ درست نہیں۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ سے جب حضورﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا کہ کیا

آپ قرآن نہیں پڑھتے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضورﷺ کا اپنا عمل قرآنی تعلیمات کے عین مطابق تھا 6:50۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ساری نبوی زندگی میں ہمیشہ ان باتوں کے کرنے کا حکم دیا جنہیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا اور ان سے روکا جنہیں قرآن نے ناپسند ٹھہرایا۔ حضورﷺ کے بعد اب ہمارا فریضہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔ یہ معروف اور منکر قرآن کریم کے اندر ہے۔ جس کا وارث حضور پاکﷺ ہمیں بنا گئے تھے۔ اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم رسولﷺ کی زندگی کو اپنے لئے بہترین نمونہ بنائیں اور اسی اخلاق عالیہ کے حامل ہوں جس بلندترین مقام پر وہ خیرالبشر فائز تھے۔

رہا یہ سوال کہ ''سنت رسول مقبولﷺ قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ اگر سنت کو نظرانداز کر دیا جائے تو قرآن پاک کی من مانی تفاسیر کا راستہ کھل جاتا ہے'' تو اس سلسلہ میں جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق حضورﷺ کی سیرت طیبہ (اسوہ حسنہ) قرآن کے اندر ہے جہاں حضورﷺ کی سیرت قرآنی آیات کی روشنی میں کچھ اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ اگر ان درخشندہ موتیوں کو ایک لڑی میں پرو لیا جائے تو اس سے نبی کریمﷺ کی حیات طیبہ نہایت آب و تاب سے کتابی شکل میں مرتب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ جہاں تک قرآن پاک کو سمجھنے کا تعلق ہے۔ تو اس کا صحیح طریق (روایات کے بجائے) ایک ہی ہے یعنی قرآن کے ذریعہ قرآن کی تفسیر۔ ورنہ انسانی تخیلات اور تصورات میں الجھ کر قرآن کا مفہوم کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ نیز قرآن ایک ایسا نور مبین ہے۔ جو خود روشن ہے اور ہر چیز کو روشن کرتا ہے 4:175۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے تعارف اور نمود کے لئے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ روشن چراغ کو دوسرے دیئے کی روشنی سے تلاش نہیں کیا جاتا۔

مذکورہ بالا کالم میں احادیث کو مرتب کرنے کے لئے بہت سی کاوشوں کو گنوایا گیا ہے مثلاً روایات کا تسلسل، راویوں کا قابل اعتماد ہونا وغیرہ اور آخر میں یہ کہ آیا کوئی حدیث قرآن پاک کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ آخری کسوٹی ہی سب کچھ ہے یعنی وہ حدیث صحیح ہے جو قرآن کریم کے مطابق ہے اور جو اس کے مطابق نہیں اسے پہلی تمام کاوشیں بھی صحیح قرار نہیں دے سکتیں۔

فاضل کالم نگار کسی حدیث کو پرکھنے کا ایک نیا اور انوکھا معیار سامنے لائے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''مودودی صاحب نے بجا طور پر کہا تھا کہ حدیث کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والے کے اندر ایسا ذوق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ پہچان جاتا ہے کہ یہ الفاظ اور انداز بیان حضور اکرمﷺ کا ہے یا نہیں۔ یہی دیکھئے کہ جو شخص کسی اچھے شاعر مثلاً غالب سے عقیدت رکھتا ہو۔ اس کا کلام اس کے زیر مطالعہ رہتا ہو۔ اسے کسی اور کا شعر غالب کا شعر کہہ کر پیش کیا جائے تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ غالب کا انداز بیان نہیں۔'' تحریک پاکستان کے دوران علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے بار بار اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی۔ مودودی صاحب کی پہلے تو یہ کوشش رہی کہ پاکستان بننے ہی نہ دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے تحریک پاکستان کے زمانے سے ہی کہہ دیا کہ ''مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے''۔ (مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم ص 93)۔ لیکن جب پاکستان بن گیا تو

مودودی صاحب نے یہ سکیم مرتب کی کہ جس تھیا کریسی کو مٹانے کے لئے اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اس مملکت کو قائم کر دیا ہے۔اس میں وہی تھیا کریسی ہی مسلط رہے۔ چنانچہ اس وقت پاکستان میں جو تھیا کریسی مسلط ہو چکی ہے۔ وہ مودودی صاحب کی سکیم کا ہی نتیجہ ہے اور زیر بحث کالم اپنے انداز فکر' ذہنیت اور تعبیر اسلام کے لحاظ سے پوری آب و تاب کے ساتھ اسی تھیا کریسی کا ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کالم نگار مودودی صاحب کی احادیث کی صحت کے بارے میں سو فیصد تائید کرتے نظر آتے ہیں۔جس میں وہ کہتے ہیں کہ اطاعت رسولﷺ انہی احادیث کی رو سے کی جا سکتی ہے۔ جسے ''مزاج شناس رسول'' صحیح قرار دے۔مولانا چونکہ اس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے لہٰذا ان کی جماعت کے نزدیک ''مزاج شناس رسول'' خود مودودی صاحب ہی بنتے ہیں۔ (الفرقان مئی جون 1955ء)۔لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے ہم خیال لوگوں کے معیار کے مطابق اہل حدیث اور دیگر اسی فیصد حضرات ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ جوں جوں ''مزاج شناس رسول'' کی تعداد بڑھتی جاتی ہے فرقوں کی تعداد بھی اتنی ہی زیادہ ہو رہی ہے۔ قرآن کہتا ہے ''جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ان کا معاملہ قانون خداوندی کے سپرد کر دو وہی بتائے گا کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا 6:160, 30:32, 3:104''۔

اب ان فرقہ بندیوں میں ملوث ہونے کے باوجود اگر کوئی ''مزاج شناس رسول'' کے مقام پر فائز رہنے کے لئے بضد ہے تو اس کی مرضی۔قرآن اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا۔ باقی رہا ان روایات سے غالب کے اشعار کی مثال کا موازنہ تو۔ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ایک طرف تو وہ احادیث کو وحی خفی کا درجہ دیتے ہیں تو دوسری جانب ان کی صحت کے لئے شعراء کے کلام کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔جبکہ وحی ایک وہبی علم ہے۔وہ ایسی انسانی کاوشوں و ریاضتوں کا محتاج نہیں ہوتا۔لیکن یہ ہم وحی قرآنی کی بات کرتے ہیں۔وحی خفی کی نہیں جس نے سارے قرآن کو شبہات کی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔جبکہ ہمارا یہ پختہ ایمان ہے کہ قرآن کریم بعینہ اسی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔جس شکل میں اسے نبی اکرمﷺ نے امت کو دیا تھا اور اس حقیقت کے متعلق اپنوں کی نہیں غیروں کی شہادات بھی ریکارڈ پر موجود ہیں۔ادھر صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے کتابی شکل میں قرآن نہیں لکھوایا تھا۔لیکن اگر صحیح مسلم کی ورق گردانی کی جائے تو وہاں نبی اکرمﷺ فرماتے ہیں کہ ''قرآن کے سوا میرا کوئی قول قلمبند نہ کرو اور اگر کوئی شخص ایسا قول لکھ چکا ہے تو اسے مٹا دے''۔اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ صحابہ کرامؓ سے فرماتے ہیں کہ گھر جاؤ اور احادیث کا تمام ذخیرہ اٹھا لاؤ۔ جب یہ ذخیرہ جمع ہو گیا تو آپ نے تمام صحابہؓ کے سامنے اسے جلا دیا۔(طبقات ابن سعد' ص 14)۔

بات ابھی ختم نہیں ہوئی کالم کے آخر میں بڑے وثوق کے ساتھ تحریر ہوتا ہے کہ ''یہ بھی درست نہیں کہ حضور نبی اکرمؐ کے دور مبارک میں کوئی مجموعہ احادیث تحریر میں نہیں آیا تھا۔ فاتح مصر عمرو بن العاصؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ زہد و تقویٰ میں مشہور تھے۔انہوں نے حضور اکرمﷺ کی اجازت سے ایک مجموعہ احادیث باقاعدہ قلمبند کیا تھا۔ جسے وہ صحیفہ

صادقہ کہتے تھے۔ حضرت انسؓ کے پاس بھی ایک تحریر شدہ مجموعہ احادیث تھا۔ جس کے متعلق وہ فرماتے تھے کہ انہوں نے وہ احادیث حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کر کے ان کی منظوری حاصل کر لی تھی''۔ یہ سب کچھ بجا لیکن جب صحیح بخاری کی رو سے حضور ﷺ نے قرآن بھی کتابی شکل میں نہیں لکھوایا تھا تو پھر احادیث کے یہ تحریر شدہ مجموعے کہاں سے آ گئے۔ یہی نہیں حضور نبی اکرم ﷺ نے ان مجموعوں کی منظوری بھی دے دی تھی کہ انہیں مرتب کیا جائے۔ ظاہر ہے وہ بھی زبانی کلامی نہیں تحریری ہی ہو گی۔ بات کچھ بھی ہو ہماری مذہبی پیشوائیت اس قسم کے کالم لکھوا کر اور پھر انہیں نوائے وقت' جیسے وسیع اشاعتی ادارے کے ذریعہ بار بار دہرا کر قرآن پر ان روایات کی فوقیت منوانا چاہتی ہے۔ چلو یوں ہی سہی۔ لیکن ایسے اقتباسات پڑھ کر ہر مسلمان کا جذبہ ایمان اور اشتیاق اس خیال سے مزید بڑھ جاتا ہے کہ کیوں نہ میں بھی حضور نبی کریم ﷺ کی ایسی مبارک باتوں اور اقوال کو خود پڑھوں جنہیں حضور ﷺ کی منظوری اور اجازت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ ہماری یہ آرزو اور تمنا پوری نہ ہو سکی' جب فاضل کالم نویس نے خود ہی ہماری ساری خوشیاں اور خوش فہمیاں اقتباس کے آخر میں یہ لکھ کر ختم کر دیں کہ ''مگر اس سلسلہ میں پوری کوشش اور کاوش کے باوجود بعد کے مجموعوں میں ایسی احادیث رہ گئی ہیں یا ان میں داخل کر دی گئی ہیں جو روایات (کے معیار؟) پر پوری نہیں اترتیں اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

حضور! آپ نے جو کچھ کہا درست کہا
مرا مقام ہی کیا ہے جو میں برا مانوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری' مانچسٹر

نوعِ انسان کے لئے قرآن میں شفا ہے

آج دنیا کی حالت اس سے کہیں زیادہ نازک اور تشویش انگیز ہو چکی ہے' جو زمانہ نزول قرآن کے وقت تھی' لیکن جس طرح قرآن کریم نے انسانیت کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں گرنے سے اس وقت بچا لیا تھا' آج بھی اس میں اتنی قوت اور صلاحیت ہے کہ وہ گرتی ہوئی انسانیت کو سنبھال لے اور راستے کی پرخطر گھاٹیوں سے بچا کر صحیح وسلامت منزل مقصود تک پہنچا دے' اور دنیا ایک بار پھر اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے کہ جو قوم قوانین خداوندی کا اتباع کرے گی وہ خوف وحزن سے مامون رہے گی (القرآن 2/38)۔ قرآن' پریشان خاطر وافسردہ حال' حیران وسرگرداں' راہ گم کردہ انسانیت کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تم تباہی وبربادی کی مہیب قوتوں سے مت خوف کھاؤ' تاریک مستقبل کی اندوہناکیوں اور ہلاکت سامانیوں سے مت گھبراؤ' جی نہ چھوڑو' حوصلہ نہ ہارو' مایوس نہ ہو' میں جو نظام پیش کرتا ہوں اس کی صداقت پر بھروسہ کر کے اسے عملاً آزماؤ' پھر دیکھو کہ تم شکست وریخت کی ان تمام قوتوں پر غلبہ پا کر' کس طرح خاک کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچتے ہو 3/138۔ یہ نظام اس کے سوا کیا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے 45/13 ان کے ماحاصل کو وحی کی عطا کردہ اقدار کے مطابق نوع انسان کی نشوونما کے لئے صرف کیا جائے۔(5-97/4)۔اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ دنیا میں وہی نظام حیات باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہو (13/17)۔ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ ایک خطہ زمین کو اس نظام کی تجربہ گاہ بنا کر اس کے درخشندہ وتابناک' حیات بخش وانسانیت ساز نتائج کو دنیا کے سامنے لایا جائے اور یوں مضطرب وپریشان اقوام عالم کو بتایا جائے کہ ان کے لئے امن وسلامتی کا راستہ کونسا ہے' ان سے کہا جائے کہ تم نے تنہا عقل کی راہنمائی کو آزما کر دیکھ لیا (84/6) اب ذرا وحی کی شمع نورانی کو دلیل راہ بنا کر دیکھو' پاکستان کے موجودہ حالات میں فکرمندی کی بات یہ نہیں کہ ہمیں سیاسی اور معاشی استحکام نہیں اور ہم امریکہ کی سفاکانہ یلغار کا مرکزی ہدف ہیں' تشویشناک بات یہ ہے کہ کسی طرف سے بھی روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی' نہ ہی ریاست اور سیاست کے ایوانوں سے' نہ ہی عسکری قیادت سے' نہ مساجد کے منبروں سے اور نہ ہی عوامی سطح سے' ہر طرف گھپ اندھیرا ہے' کہیں سے بھی شرار آرزو پھوٹتا نظر نہیں آتا' سورة

الانعام میں ہے کہ ایک شخص مردہ ہو اسے از سرِ نو زندگی عطا ہو جائے' اس کے بعد اسے ایسی نورانی قندیل دے دی جائے جس سے وہ خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے' اس کے برعکس دوسرا شخص ہے جو سخت تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے نکلنا نہیں چاہتا' کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں' کبھی نہیں' یہی حالت ان صداقت سے انکار کرنے والوں کی ہے (6/123)۔ سورۃ یونس میں ہے کہ (افراد اور اقوام) کی زندگی اور موت جیسا انقلاب عظیم بھی قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے اور تمہارے اعمال بھی اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں اس کے حیطہ اقتدار سے باہر جا ہی نہیں سکتے (سوچو کہ وہ قانون خداوندی کس قدر لاانتہا قوتوں کا مالک ہے)۔ اے نوع انسان یہ قانون تمہارے نشو ونما دینے والے کی طرف سے اس ضابطہ ہدایت (قرآن) کی شکل میں تمہارے پاس آ گیا ہے' اس میں ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقف اضطراب رکھتی ہے' اور جو ہر اس قوم کی جو اسے اپنا ضابطہ حیات تسلیم کر لیتی ہے کامیابیوں کی راہ کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور انہیں سامان نشو ونما سے بہریاب کر دیتا ہے (10/56-57) سورۃ طٰہٰ میں اللہ کی طرف سے انسان پر اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ جو فرد یا قوم میرے قوانین سے اعراض برتے گی تو اس کی معیشت (روزی) تنگ ہو جائے گی' اور ہم اسے یوم قیامت اندھا اٹھائیں گے۔ (زندگی کی روشن راہیں اس کے سامنے تاریک ہوں گی)۔

(بشکریہ جنگ لندن' بابت 24 مئی 2004ء)

What is the genuine end?
The Individual or The State?

By G.A.Parwez
English Rendering and Editing by
Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque

==============================

IMPORTANT NOTES

English-speaking readers may find the following explanation of terms used in this pamphlet useful:

Allah: It is the Arabic word for The One God. It is a misnomer as God has no names, only attributes.

Deity: A god/God or goddess, Divinity. From Middle English *deite*, from Old French, from Late Latin *deitas* (stem *deitat-*), from Latin *deus*, god.

Deen: It is a term with no exact English equivalent. It means "Way of Life", and in the Islamic context, is a social system based on Qur'anic values.

Jagannath: It is also known as Jagannatha, Juggernaut, Juggernnath, and Juggernnatha. In Hinduism it is a title of the deity Krishna, a huge wagon on which an idol of the god Krishna is drawn in procession. [From Hindi *Jagannath*, from Sanskrit *Jagannatha*: *Jagat-,* world+*nathas*, lord.] In *Hindu mythology* the ***chariot of Jagannath*** is specifically a vehicle used in an annul procession in Puri Town, in the Indian State of Orissa and is a symbol used for the owner of the world.

Kaafir: Literally "unbeliever". According to Sura 5, Verse 44, those who do not live by the Laws as revealed in the Qur'an are Kaafirs.

Muhammad: The name Muhammad, the Messenger of Allah, is generally followed by the salutation "Peace Be Upon Him". As this ("Peace Be Upon Him") is not used in the Qur'an, and for the sake of brevity it is not used as such in this pamphlet; it has been indicated as PBUH or pbuh. However, it should be implicit that, as mentioned in Sura Al-Saaffaat 37, Verse 181, we do convey Peace Upon all the Messengers of Allah, and Praise be to Allah, the Originator and the Creator of the Universe.

Nubuwwah: It is the reception of the revelation of Divine Guidance by ***anbiya*** or ***rusul.*** It ended with Muhammad (PBUH). The Guidance revealed to him is preserved and enshrined fully and exactly in the Qur'an. But the function of ***risalah***, or the delivery of the Divine Message to all mankind and the establishment of a social order in accordance with its

principles, has devolved upon the nation or ***Ummah*** that believes in that Book, that is, the Qur'an.

Shirk: It is the only unforgivable sin in the Qur'an. It is the association of partners with Allah, whether it be the human world or the physical world or the obedience to laws in contradiction to those revealed in the Qur'an. This includes creating divisions within the Muslim community through sectarianism.

==========================

What is the Genuine End?

The Individual or The State

The history of mankind makes tragic reading. Down through the ages we come across a series of sequences of the rise, growth, decline and fall not only of nations but also of their civilizations and cultures. The basic but the most intriguing question of the general aspect of mankind has always been whether the Individual for the State or the State exists for the Individual. In other words, "What is the real aim and what are the means to achieve it?" Many renowned researchers and erudite thinkers have penned down their discourses on this subject. I a humble student of Qur'an, present here 'what the Qur'an has said on the subject.

Man is a social being with the basic to live in the company of other men. He is gregarious by nature and, in the words of the renowned western thinker, Nietzsche, he can become human only when he is in the company of other men. Our experience also stands proof to this reality. If a human child soon after birth, is left in a jungle, without the supervision of any human, and some animals bring him up, he will remain animalistic in his behaviour for the rest of his life. He will never attain the posture and status of humanity, though he would be just like other humans in the pattern of his figure and form.

Look at another aspect of human life. Of all the punishments the human mind could devise, solitary confinement is the most severe, the most cynical, and the most ironical. The cruelest criminals of the strongest nerves, not afraid of the death sentence even, start crying when they are kept in solitary confinement, even though there be no physical suffering. Have you ever thought of the phenomenon that the concept of 'chastisement in grave' is more terrifying than that of the scene of the 'resurrection day'? Its root cause is nothing but solitary confinement. In the grave the dead body is in a solitary state, whereas there are tens of thousands of men, lurking and hovering on the 'resurrection day'. Supporting this contention, one of the sayings goes that "the crowd of the dead is nothing but rejoicing of a festivity". Another old proverb says "man is the remedy of man". The Urdu word for 'society' is 'Mu'aashra' which has the component 'ashra'(the Arabic term for number 10) signifying the fact that it takes two digits to make number ten. The implication is that 'society' is formed by individuals coming together.

Tribal Life

Family was the stepping stone of collective life in the very early period of human life. Dependence on family satisfied the cultural and social needs of the individuals. When the family multiplied a bit, it took the form of a tribe. Tribal life was nomadic, wandering and

traversing here and there, every day, every morning and every evening. Therefore, there was no question of any specific area reserved for tribes. When they first started keeping flock and then opted for agriculture economy, the question of specified and demarcated areas arose: this piece of land belongs to so and so a tribe, that meadow to such and such a clan. Thus developed the concept in the human mind that slowly and gradually took the form of a country or a land of birth. People started saying: “This is my country; that is our country.” Nature never demarcated such boundaries on the surface of the earth; these are man-made.

Prior to this demarcation of boundaries on the face of earth, self-preservation was the main urge of life; it was maximally extendable to the preservation of health, home and wealth. Now it has extended and has covered the safety and security of ‘land of birth’ or country. In other words, the question of preservation had not remained limited to safe guarding the individuals; nonetheless it has more intensely involved the safety and security of the country. For deciding mutual disputes of individuals and for defending the country, the need of a collective full-fledged authority was a must. This produced the concept of governance or the idea of the State Authority. For a long time, the idea of politico-cultural life of the men remained restricted to country and its governance. Thereafter, Greek scholars, especially Plato (c. 428-347 BC) presented another idea, which is termed as State. If looked at generally (but nay, to me it is a fact that) State is but an establishment of governance in a country. But the political philosophy made such an addendum to it that it revolutionized its concept. Initially it was a simple issue: country meant a specific track of land, its defence meant the safety and security of the home and wealth of its inhabitants. This was achieved through a system, called rulership. When it was transformed into State, the questions arose:

- What is the mutual relation of the State and the Individual?
- Which of these two is the means and which one is the end?
- And the like.

These questions generated various theories, such as:

1. Monistic Theory, which means the individuals are the integral part of the State; they do not enjoy their own separate entity
2. Monadistic Theory, through which it is accepted that State is nothing but a conglomeration of individuals
3. Dualistic Theory, which means the individuals have their own separate distinct existence but they are dependent upon the State or Society for their betterment and welfare.

So far, so good. But later on another theory was put forth, which established the State **as an end in itself**. This theory is called Idealistic Theory or Absolute Theory. It is not my intention here to expose, elaborate and illustrate the Theory of State from the political science point of view. My concern in this discourse is the mutual relation of State with Individual, so I will not deliberate upon the details of the various theories of the State. After this brief introduction of the various theories, I want to move directly to my topic. Since the Idealistic Theory is basically related to the topic under discussion, a detailed description of it is necessary. Hobbes (1588-1679), an English political philosopher and thinker initiated the basic concept of this theory: individuals, in the real sense, are the slaves of the State. And Hegel, the German philosopher, provided a complement to this theory.

Hegel's Theory of State

Hegel (1770-1831), a German philosopher, insists that "the State possesses an 'organic' unity, which 'is dialectic'; a unity of contraries. It not only allows but requires the strongest tensions and oppositions." It has its own separate entity and unique personality. Like every living and conscious being, it has its own aspirations, passions, and intentions. Its rights and obligations are finite. "There is no longer any moral obligation for the State. If there is any duty of the State it is to preserve itself." If there is a clash between the individual and the State, the State will stand justified.

The State enjoys absolute rights. Cassirer, a renowned Americo-German thinker, has explained this theory of Hegel's in the following words:

> **State is the self-certain absolute mind, which acknowledges no abstract rules of good and bad, shameful and mean, craft and deception.**
>
> **(Myth of the State, P. 264)**

He also writes in the same book:

> **It is generally acknowledged and well known principle that the particular interest of the State is the most important consideration. The State is the spirit that dwells in the world and realizes itself in the world through *consciousness,* while in nature the spirit actualizes itself only as the other of itself, as dormant spirit. It is the course of God through the world that constitutes the State. When conceiving the State, not of particular institutions, but one must much rather contemplate the *Idea,* God as actual on earth, alone. (Myth of the State, P. 265)**

Hegel propounded this theory in the 19th century (in 1801) and slowly it spread in the entire world. Rumelin, Chancellor of Tubingen University, wrote in 1875 that:

> **The State is autocratic. Self regard is its appointed duty; the maintenance and the development of its own power and well-being. Egoism - if you call this egoism - is the supreme principle of all politics. The State can only have regard to the interest of any other State so far as this can be identified with its own interest. Self devotion is the principle for the individual; self assertion for the State. The maintenance of the State justifies every sacrifice, and is superior to every moral rule. (R. H. Murray, The individual and the State, P. 216)**

From the above-mentioned illustrations, it can be seen that, according to this theory, Divine Rights are given to the State. That is why this type of thought and this kind of procedure are known as Divinisation of State i.e., to make the State a god. In this way the State becomes a lord, and its individuals its worshipers. This has become a modern religion and has its own beliefs and code of conduct. In this religion, the State attains the status of god.

As has been said earlier, Hegel propounded this theory, which slowly and gradually spread in the world and now has attained the status of "religion" all over the world. The terms would be different, the words would also be variant, but politically the State, in the real sense, enjoys the same status every where. Every where the word State is talked of as if it is really a living personality, having the status of a deity, of a god or of a lord. It was the same concept of the present-day-fashioned deities about whom Dr. Muhammad Iqbal (1876-1938), the Muslim thinker, said that the concept of 'country' is the biggest deity of the modern day. The position

of the Divinisation of State is that whenever it is said 'it is the demand of the State', no body dares object it or criticize it, not utter a single word against it. Compared to the superiority of its order or its demand, the individual's interest, expediency, demand, aspiration, desire and passion carry no weight. The individuals come into being to be the slaves to the State, to be the means to accomplish its demands. Individuals hold no will. It is the State that enjoys universal will and supreme power. The individuals should be prepared to lay down their lives for it. Whenever the State should make a demand, it is the duty of the individual to accomplish it unhesitatingly. Whatsoever it demands, he should humbly present it to the State, even though it is life itself. Life is no exception.

For the last so many years, this position of the State has been so well propagandized that the thinking faculties of people appear to be paralyzed. Whenever it is said **'it is the demand of the State '**or **'it is the order of the State'**, no one thinks or asks any one as to **'where is that State which has issued this order? Where does it live? Where can it be found?' Is there any possibility to meet it so that it could be asked whether it has issued this order?** Neither any one asks, nor any one answers, but it is the State that continues implementing its orders. And it is the people that continue blindly following them. The Deity of the State and the concept of its absolute powers dwell sacredly in the hearts of the people. It is surprising that men demanding evidence for the existence of God unequivocally accept the 'existence' of the State. It is as if it is an established reality that they obey with no arguments, no reason or rhyme.

Reality of the State

If one calmly analyzes the elusive entity of State one has accepted without any reason or rhyme, one will come across the same phenomenon, which Sultan Mahmood of Ghazna, Afghanistan, found in the temple of Soumnat, a city on the western coast of India. When Mahmood conquered Soumnat in 12^{th} century, varying supranatural fictions about the statue of Soumnat, were wide spread among the masses. The most amazing among them was 'when people pray to it for their boons, it answers them and everyone can hear it answering'. Mahmood was a monotheist; he could not be trapped in such deceitful jugglery. He cast a deep eye at the form, structure of the temple and the statue. All of a sudden he perceived the reality and with one stroke he broke the back wall into pieces. He saw Hindu priests sitting there to answer prayers. Likewise when you remove the veil of the statue of the State, one finds a few authority-vested individuals sitting behind this curtain, holding the contract of the rulership as the legal basis of all civil power. Their orders are the orders of the State, their decisions and judgements are the decisions of the State, their interests are the interests of the State, and their demands become the demands of the State. These authority holders, in the name of Divinisation of the State, get themselves worshiped by individuals of society. With this kind of analysis i.e., removing the curtain of the State, you will find no separate existence of State in the world. It remains nothing but an abstract idea. The concrete reality is nothing except that it is a country and has a Governing body vested with power and authority. Look at it again and again and you will find these two solid things in this idol-temple of the State; there is no third thing in it. The fact of the matter is that when autocracy became notorious, the men's lust of power and exploitation created another mode of governance and called it State, which had become notorious in the garb of dictatorship and monarchy. Under the imaginative piety robes, it was assigned the status of Divinisation of the State. Whatsoever be

the system of governance, it will have the same character and essence of the will of monarchy. In the Dark Ages, the king used to issue orders in his name. And now in this age of modern civilization, the same orders are issued in the name of the State, which has no separate existence except the will of the ruling authority. The orders of those days were by the authority holders and the same prevails today. In both the systems the authority wielded the same status and position. The only difference is that when the orders were issued in the name of the king, he used to accept their responsibility and the subjects knew it well who was responsible for those orders. Now the orders that are passed in the name of the State, neither is there any one to accept their responsibility, nor can it be determined: who is responsible for them. In those days the king could have a bad name because of his wrong orders; now such orders do not defame any body because these are from the State, which is an abstract idea, has no external existence, and exists in the minds of people alone. In the dark ages, such a kind of elusive persona holding power was called deity or god, now it is called State. As neither can any one see these deities or gods, nor can any one criticize their orders, similarly neither can any one see the goddess of the State, nor can criticize its orders. The people, in those days, were crushed under the authority of the king, the chariot of Jagannath, and now are sacrificed on the altar of the goddess of the State. The objective is the same. It was the satisfaction of the blood-sucking passions of the priests of the goddesses, and now is the satisfaction of the State. The difference is of words and the terms used. Erich Fromm (1900-1980), a German born renowned American psychologist, in his book **Escape From Freedom**, has shed light on the effective use of language (words) in modern times:

> **Never have words been more misused in order to conceal the truth than today. Betrayal of allies is called appeasement, military aggression is camouflaged as defense against attack, the conquest of small nations goes by the name of a pact of friendship, and the brutal suppression of the whole population is perpetrated in the name of National Socialism. (PP. 300-301)**

We want to add to it that the monarchy of the ancient times now has been concealed in the term **'**State**'**. It has been made ambiguous to the extent that no clear conception of the State can come to mind. In spite of this fact, this deceitful doctrine has been made such a reality that individuals are unhesitatingly sacrificed for it. And it is all done on the basis that individuals exist for the State. The question is **'what is the proof that individuals exist for the State?'** Its answer lies in a simile of Aristotle's.

Jugglery of Similes

Keep in mind that the wrong use of similes has wrought such a loss and harm to the world of humanity that no one can guess it. The wrong simile projects wrong as right. It can deceive even the most prudent of us. Since reality is abstract, it does not come perceptibly to mind. A simile is used with concrete examples, so it sticks quickly to mind. If it is right and relevant, it makes the abstract reality understandable but if it is deceitful, it makes right as wrong and wrong as right. The Qur'an calls the deceiving-idea-ridden similes as "poetry" and emphasizes not to use it. The concepts of mysticism are based on similes; hence "poetry" supports it. That is why Ali Hazeen, a Muslim Sufi (mystic), had said: "Mysticism is the best mode for poetry." One or two examples will make it clear. One of the beliefs of mysticism is monotheism, which in simple and brief words means the things visible in the universe do not have their own existence; God alone has existence and is visible in various forms and patterns. These various names and patterns of things deceive us, otherwise reality is one and the same every where.

The root-cause of all intera-religious conflicts is the difference in terminology for the one and the same Reality (God), which stays the same in essence whether It is labeled Ram (Hindu) or Raheem (Muslim) or any other. It is evident that this idea or belief is absolutely wrong. But look how beautifully does a wrong simile project such an open deception as reality! That simile is: "The 'Ganges' is one, but the 'ferries' are numerous; it is nothing but the confusion of the wits." You see this simile outweighs tens of thousands of arguments. This simile sticks to mind and no reason works against it.

Or take another example. Mysticism has to pass on the concept that direct achievement of beneficence of God is impossible. When the refulgence and manifestation of Allah is achieved through the beneficence of the spiritual guide, it produces stimulating effect. In terms of a simile, it can be understood that if you 'keep a cotton bud in the sun for the whole day, it will maximally become hot. But if the same rays of the sun pass through a converging lens, this flock of cotton will start burning within seconds.' Similarly when the rays of Allah's love pass through the converging lens of spiritual guide's look, the heart of the disciple transforms within no time into a pirouetting flame and burns down every thing except Allah.

The Simile of Aristotle

This is what the wrong use of the similes does. Look, how the simile of Aristotle (384B.C. – 322B.C.), the Greek ethical, metaphysical, and political philosopher, presents pleasantly as reality the deception that the existence is only of the State and not of the individuals! He says as the State is to the individuals so is the human body to its organs. The human organs do not have their own separate existence. These are simply the integral parts of the body. Their life and death are tied to the life and death of the body. Their duty is to supply the provisions of life and means of health to the body. This garners the arrangements of their own life and health. No organ can survive without the existence of the body. The expediency of the body is the prudence of the organs. Hence the organs cannot have rules and regulations other than of the body's. Nor do the organs become the integral parts of the body on their own wish and will. And likewise nor can they be separated from it on their own.

I shall speak of the weakness of this simile later on. You have seen here that on the basis of this body-organ relation, individuals have no separate existence. They become the means of establishment, solidarity, and promotion of the State. And the State becomes an end in itself. We have also understood that if the theory of the State is analyzed, it is nothing more than the body of a few members, who have authority. This is a deceiving veil, designed for concealing dictatorship and totalitarianism in its garb. As has been exposed earlier, Hegel (1770-1831) propounded this theory, Nietzche (1844-1900) made it grow, Hitler (1889-1945) provided it the mould of Nazism, and Mussolini (1883-1945) transformed it into fascism. And in the Social Republics, it was exposed as Dictatorship of Proletariat. The democratic countries proudly claim that they do not have dictatorship, they have democracy, the Government of the people, in their countries. But this is a deception too. These countries have the same concept of the State as do the dictator-ridden countries. Individuals have no importance there. Recently an American psychologist, Charles M. Fair, has published a sophisticated but myth-breaking book. Its very name, **The Dying Self**, brings forth its contents and the true picture of this unfortunate contemporary man. He has written a variety of tactics contemporary man has devised for crushing the 'I-am-ness' of the individual. He says leave aside the autocracy; even democracy is not less harmful. In support of his assertion, he has deduced much from DE – Tocqueville's book: **Democracy in America**. A gist of one excerpt from his book is given below:

(Continued)

==================

The shackles and the tyrants were the blunt tools, which the exploiters used to use in the past. It is as if the kings had physically actualized exploitation in those days but the democracy of the present time has made it out and out a mental problem. Now the master does not say: **"Think in terms of what I think otherwise you will be killed."** Now he says: **"You are free to have your own thinking. In spite of this disagreement your life, property, and the other possessions will all be safe. All that would happen is that you would be lonely in the society. You will live with the people, deprived of your human rights. Your fellows will hate you as a filthy thing is despised, even those who think you are innocent and faultless will sever relations with you, so that the people may not hate them."** The master says to them; **"Go and be in peace; I have spared your life."** But this is the life, which is even worse than the death. **(The Dying Self, P. 185.)**

Such is the status of the individual in democracy. In this system snapping ties with the majority, the individual becomes wet paint; no one wants to develop relations with him. He remains lonely, deserted, dejected in the whole wide-world. What happens to the people left lonely in the living society can well be judged from the book "Lonely Crowd" published recently in America. With the help of the data and detailed observations of the individuals, the authors of the book have presented the status of the American society. In such a society an individual lives along with other members of the society as the cogs of a machine. During the last two or three years, I have mostly been citing quotations from the various books of an American psychologist, Erich Fromm. In one of his books, **Escape From Freedom**, one reference from which I have already given, he writes on this topic:

> **The person who gives up his individual self and becomes an automation, identical with millions of other automations around him, need not feel alone and anxious any more. But the price he pays, however, is high; it is the loss of his self. (P. 209)**

In another of his books, **The Revolution of Hope**, he writes '**the society in which the man is dehumanized, his political freedom does remain no more freedom, but slavery' (P. 91)**. The same author further writes that the obligation of society is to respect human life. The positive or the good act is the one that facilitates the development of the individual's latent potentialities. The negative or evil act is one that strangulates the life and stagnates the human activities (P.93).

Ernst Cassirer, who has been mentioned earlier, is a world known philosopher. He died recently. His last book, **The Myth of the State**, is about the problem of State. Discussing on the rights of individual and State, he writes:

> **There is, at least, one right that cannot be ceded or abandoned: the right to personality . . . There is no *pactum subjectionis*, no act of submission by which man can give up the State of a free agent and enslave himself. For by such an act of renunciation he would give up that very character which constitutes his nature and essence: he would lose his humanity. (P. 175)**

Discussing the rights and responsibilities of the individual and State, Professor I. MacIver, in his book **The Modern State** writes that the State governs to serve individuals. It controls the wealth of the country to repay the debt of individuals. It creates the rights, not to give charity

as an upper hand on the basis of authority it enjoys, but as its agent. Keep it in mind that the individuals are the masters, not the slaves, of the State. It is clear the slave cannot enjoy a higher authority than the Master can. As are human rights determined and restricted in terms of their responsibilities, so ought to be the rights of the State (in relation to its responsibilities) (P. 480).

Right from here the weakness of Aristotle's simile of body-and-organs relation becomes clear. It was this simile on the basis of which he called the State 'the end' and the individual the means to that end'.

The Hollowness of Aristotle's Simile

He said it is the body alone that has existence; the organs do not have their separate distinct entity. This assertion opposes reality. The existence, in fact, is of the limbs and the organs, and not of the body. The body is simply the collection of limbs and organs, mutually linked with co-ordination, co-operation, proportion, and regulation. You go on cutting separately the various organs of the body, the legs, the arms, the torso, the head etc., you will see these parts lying separately, but the body will disappear. The existence of the body is merely a mental and conceptual phenomenon. Intrinsically it does not exist outside. Health is a balanced proportion of the various limbs and organs. When any one or some organs lose this balanced proportion and fail to perform their operation, it is called disease. If any organ becomes deadly poisonous, it is generally said 'in order to save the body, the essential thing is to cut it off'. This is said simply because of the general use of this word (body), otherwise, factually, it should be said 'it is essential to cut it off for the sake of health and safety of other organs'. This makes it clear that the individuals have their own separate identity and existence. No State can come into being, if prior to it the individuals do not exist. If there is no existence of State as a distinct entity, there can still be individuals living. But if there are no individuals, the State can never be thought of. When the individuals determine to live with mutual agreement, discipline, co-operation, and balanced proportion; they also determine to gain power for their safety, and survival, then this way of life will be termed as society or State.

The simile of **'individuals as organs and State as body'** was, in fact, coined for Plato's theory of division. According to this theory slaves remain slaves forever, and the ruling class, he calls Guardians, always the ruling class and its example is like of organs of body. The foot always remains the foot and so is the head. The foot, by enhancing its potentialities, never replace the head and vice versa. Every organ has its own position determined by birth and there can be no change in it. Therefore, no organ should aspire to become another organ, and neither should it try it. Nor should the low-level organs rebel against their assigned duties only because these are of low level. With this simile, Plato said that the class division was by birth and was unchangeable. Aristotle, with this simile, made individuals the slaves of the State. It is clear how misuse of similes transforms the right into wrong and vice versa. Sir Mohammed Iqbal, the renowned Muslim thinker, interprets it as the magic spell of the ruling class.

Aristotle coined this simile; Hegel founded the entire edifice of politics on it. The result is that everywhere in the world there is autocracy, whatever name it is assigned. In this regard, there is no difference between dictatorship and western democracy.

This spell of the ruling class functions with the illusory concept of the State, which is an end in itself, and the individuals are the means to justify it. Erich Fromm makes this difference of dictatorship and true democracy clear in the following words:

> **Democracy is a system that creates the economic, political, and cultural conditions for the full development of the individual. Fascism is a system that, regardless under which name, makes the individual subordinate to extraneous purposes and weakens the development of genuine individuality. (Escape From Freedom, P. 301)**

Bergson (1859-1941), a French philosopher, has explained this important point in the following words:

> **This will be sovereignty, not over men, but over things, precisely in order that man should no longer have so much sovereignty over men. (The Two Sources of Religion and Morality. P. 300)**

Lust for Power

Cassirer says that this holistic, autocratic, comprehensive, and cruel concept of the State is the creation of people's lust for love. About this lust, he writes:

> **Obviously we do not wish for the sake of wishing - we aim at a certain end and we try to attain this end. But the lust of power does not admit of any possible attainment. It is the very character and essence of the will of power that is inexhaustible. It can never come to a rest; it is a thirst that is unquenchable. Those who spent their lives in this passion are comparable to the Danaides: they strive to pour water into a leaking butt. The appetite for power is the clearest example of that fundamental vice that, in Plato's language, is described as "pleonexia" – as the "hunger for more and more." This craving for more and more exceeds all measure and destroys all measure – and since measure, right proportion, "geometrical equality" had been declared by Plato to be the standard of the health of private and public life, it follows that the will to power, if it prevails over all other impulses, necessarily leads to corruption. "Justice" and the "will to power" are the opposite poles of Plato's ethical and political philosophy. (The Myth of The State. PP. 74 – 75)**

And when this lust for power is concealed in the sacred robe of "State Interest", these lust hungry mongers lose the prick of their conscience, which often rises against the open tyranny. You make the other men means of consolation for satisfying your own passions of revenge, and torture them, then (even if your own conscience is dead) the other people will protest against it. But when this is said, **"Doing it is in the interest of the State"**, then in stead of opposing it, the people will generally extend support to it. You will be thought of as a patriot and well wisher of the State. Strangely no body will ask you whether doing this is really in the interest of the State. If any body raises a voice against it, he is told that the disclosure of this secret is not in the interest of the State. Nonetheless, as has been explained earlier, the existence of State is an imaginary concept. By eradicating this deceptive idea, if it is clarified in mundane terminology, then the end and standard of collective system of men will be the interest of the individuals. This is such a concrete standard where neither can any one be

deceived, nor can any one deceive some one else. But the concept of State is an amazing show where the State is rich and the individuals are poor; where the State is strong and powerful and the individuals are weak, feeble, and frail. And where the wealth of the State increases and the individuals go on becoming poor to poorer to the poorest. (According to the erroneous simile of Aristotle) the organs become gaunt but the body is said to be growing strong and stout. The organs are crushed or cut off one by one, but it is understood that the body is being nourished. The development, prosperity, robustness, and energy are, in fact, of those with whom the authority is vested.

(As has been described) "State" is the name of these attributes; it does not have a separate distinct existence. If, anyhow, one has to acknowledge the existence of this "phoenix", one must accept and make others accept the reality that the criteria of measuring the prosperity, the strength and the weakness of the State are the individuals of the State. If the individuals are prosperous, strong, stout, and dauntless, the State will also be rich and powerful. If the individuals are always prey to fear, pain, grief, and destitution, the State is dried-up and struck with poverty. That is why Mohammed Iqbal, the world reputed Muslim philosopher, has said, **"Every individual is the glaring stroke of good fortune of the nation, of the State".**

From the aforementioned illustrations we have seen that by carving the non-existent idol of the State, how man's lust for power has made wide pathways for tyranny! And how well it has justified them! How much blood of humanity has been sacrificed on the altar of the old hag, the black deity! How many sacrifices of man burnt on stakes are there, with which the sadistic nature of the tyrants is satisfied! The fact of the matter is that whatever the priests, in theocracy, do in the name of God, the same, in secularism, is done in the name of the State. Neither could any one ask God "Was whatever is done with us in Your Name really your demand"?. Nor can any one ask the goddess of the State "Are whatever sacrifices we are compelled to offer, really under your authority"? The God of theocracy was imaginary and conjectured; the deity of the State is also mental and imaginary. One was the deceitful idea conjectured by the Hindu priests, and the other is the spell-ridden concept knit by the Hindu bankers. The only difference between the two is: one was knitted at the looms of dark ages, so it was coarse and thread-bare; the other is made by the machines of modern civilization, hence is so fine and subtle that no eye is able to penetrate to the inherent deception it has.

Qur'an's Truth-Revealing Message

The Qur'an was revealed. It exterminated all the man made idols from the mental horizon of humanity. The Qur'an brought the collective infrastructure of the man. But you will be taken aback to know that the word State is not found in it. It has given only two ingredients of this infrastructure: One is the country, a track of land and the other is man, the inhabitants of that country. It defines and determines the borders of the country for initiating its program. In other words, it starts its program from a track of land; it is the only possible and easy method, otherwise it has the entire globe of earth as its aim. It wants to spread this system in the entire world. It insists to protect this piece of land (which has to be the first lab of this program). It is because if it remains safe and secure, this experiment will be conducted peacefully. It also insists to make arrangements for protecting it from the earthly and heavenly calamities. It describes the events of the nations gone by and tells us that their abodes were destroyed by

the floods, wind storms, earthquakes, volcanic eruptions, and the dilapidation of the dams. The purpose is to tell us to keep the country safe and secure from such calamities and catastrophes. It also emphasizes to protect the country from external dangers. In this regard, it says:

وَأَعِدُّوا۟ لَهُم مَّا ٱسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ ٱلْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ٱللَّهُ
يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا۟ مِن شَىْءٍ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ
لَا تُظْلَمُونَ

(8: 60)

Keep ready whatever force you can muster to meet your enemy together with strong cavalry with which you can strike terror in the hearts of those who are enemy to Allah and to you. And to those who are in your knowledge, and those besides them whom you do not know as yet. To do so, huge expenses are involved. For this purpose, whatever you expend in the cause of Allah shall be repaid to you justly. There will be no reduction in it -not even a bit.

The State was an imaginary concept. In contrast to it, country is the name of a track of land. When we say the country is in danger, its danger can be perceived, can be seen. No body can deny it. The magnitude and the nature of this danger can be judged on the basis of the information one acquires. But its relation pertains to the degree of perception; it is not imaginary like that of the State.

What is real End /aim?

Despite emphasizing the importance of guarding it, the Qur'an deems the State the means to an end **<u>not</u>** an end in itself. A house merely serves as a residence for the people who live in it. True that the condition of a house affects the welfare of its occupants but the real importance is for the residents not the residence. To the Qur'an, Man is the real end of the existence of the country or the state or the entire Universe. Everything has been created for Man's benefit. The concept is clearly stated in the following verse.

(2:29) هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا

Whatsoever is there in this sphere of earth, God has created it **<u>for you</u>**. Not only in the earth but also:

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ
لَـَٔايَـٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

(45: 13)

'Whatsoever is there in the earth and the heavenly bodies, God has all harnessed for you'. In the words of Sir Muhammad Iqbal, the renowned Muslim philosopher:

You are neither for the earth, nor for the heavenly bodies
The entire universe is for you, and not you for it all

And further he adds:

With the warming activities of the man, is the entire tumultuous upheaval

Each and every body in the universe, the sun, the stars, is but spectators

This is the relation of Man with the Universe. But the topic under discussion pertains to the question of **mutual relation of man with man**. It is this mutual relation which gives birth to the concepts of civilization, culture, sociology, and politics; this generates various systems, rules and regulations. I have already mentioned that the Qur'an has not used the term 'the State'; it has definitely given the idea of a country, and within this concept, it has also propounded the concept of governance. We have seen the flaw in the theory of the State which was, in fact, the flaw in the system of sovereignty. The Qur'an has termed the system of sovereignty as the governance, as the management of things. Now the question arises: **what is the Qur'anic concept of sovereignty or of the system of governance? And what is the place and status of the individuals in it?**

The Qur'anic Concept of System of Governance

Whatever the system of governance in vogue in the world, the authority of some men over others remains established in one way or another. The Qur'an considers this concept as humiliating to humanity. It does not allow some men to wield authority over other men. It calls it against the concept of equality of human beings and terms it opposite to the respect of manhood. It says that the governance of men over men is wrong because it deprives the individual of the freedom he gets as man.

No human society can be sustained without a system of governance. So, what does the Qur'an suggest? It says the sovereignty belongs to God alone not to any individual or group of individuals. But, is it not theocracy/autocracy all over again, which vested sovereignty with some invisible forces beyond complaints or questions? The Qur'an responds very reasonably to this very logical question. Granting the existence of an invisible Sovereign in the Qur'anic system, there are laws which are real and visible. God's rule practically means following His Law, which is complete and unchangeable. No one has the authority to make any changes in the Divine Code, not even the Messenger. He addresses the Messenger

(5: 48) فَٱحْكُم بَيْنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ ۖ

'Judge the matters of these people according to the Book of Allah'

And declare it openly that:

(10: 15) مَا يَكُونُ لِىٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآىِٕ نَفْسِىٓ ۖ

It is not for me to make any changes therein according to my wishes.

What a great satisfaction have the individuals of the society (nay but the entire humanity) acquired that the governance over us will only be of this Book alone! Orders will only be of His to be executed. Other than Him, nobody will have the right to make us obey him. Even the one who makes us obey His Laws will himself first obey these Laws. From this point of view, there will neither be any ruler nor any ruled.

The End of *Nubuwwah* as Manifesto of Freedom

I have just said that the satisfaction (that no one among us will be able to exercise authority over others, the obedience will only be to this Book, the Qur'an) was not only restricted to the

men of the time of the Messenger (pbuh). It will also be equally applicable to the last man on earth. It was because after the completion of Al-Qur'an, it was promulgated that the sequence of ***Nubuwwah*** has finally ended. Now nobody till the day of resurrection will be able to say that your Allah has ordered to obey him compulsorily. Whatever Allah had to say has finally said in this Book From now onwards neither will Allah say any thing else, nor will there be any change, amendment, and modification in it. It was our hard luck (and I will say it was the biggest controversy against Islam) that the **End of *Nubuwwah*** was made just a matter of belief. Otherwise, up to the day of resurrection, it was a manifesto of freedom, and the message of death for every kind of slavery, for manhood. Pause and reflect, what a great and magnificent promulgation it was that a man, a group of people, or a nation that intends to get freedom from the slavery of men may accept this Book, and understand it! Imposed on its freedom will only be those restrictions, which have been prescribed in this Book. Now, nobody will be able to say that not only him, but also Allah has imposed such and such additional restrictions on you or has made changes in these restrictions. This was the Universal Manifesto of Freedom, which the End of ***Nubuwwah*** has granted to the entire comity of human beings. In other words it was the surety that from now onward nobody, nor any group of people, will be vested with the authority to command obedience. Nor will any body or any group of people be vested with power to impose any restrictions that are not in this Book whether that is in the name of the State or in the name of God Himself. Could there be a bigger freedom than that ever conceptualized? Or can it be imagined?

The Purpose of These Restrictions

Now the question is what is the purpose of the limitations or the restrictions prescribed in the Book of Allah? The purpose of man-imposed restrictions on other men is either to decrease or to restrain the vested authority of those on whom these restrictions are imposed. In other words it targets to limit or to divest their freedom. But the Qur'an says that God-imposed limitations and restrictions never mean to limit or to divest human freedom. The aim is never to achieve that purpose.

On the contrary:

(2: 286) لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

'The purpose of God-imposed restrictions is to further broaden the human personality.'

Enlarging and broadening the latent potentialities of the human personality is a psychological process, the discovery of which could have been possible (that too to a limited extent) with the development of the discipline of Psychology in the present times. Prior to this development, it was least understood. The psychologists say if the energy of the human personality that is operating for destruction is diverted to constructive pursuits, it multiplies two-fold for integration process. This process, in their terminology, is called ***sublimation.*** Fourteen hundred year ago, the Qur'an unfolded this reality. It says that the purpose of the restrictions imposed on the human personality is to broaden it by sublimation.

(2: 286) لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

By obeying the Divine Laws, the human personality is broadened. This may also mean that for the accomplishment of the task assigned, one should exert one's capacities to the full. On the ordinary level, understand this phenomenon with the following example. When water in a canal starts flowing at a low ebb, a fall of stones is built in it. The purpose is not to impede the flow of water. When water bumps against it, its flow multiplies many folds. This is the purpose of imposing restrictions by the Book of Allah.

We have seen that it was said to the Messenger of Allah (PBUH): Establish system of governance according to the Book of Allah. One of its purposes was:

(7: 157) يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَـٰلَ ٱلَّتِى كَانَتْ عَلَيْهِمْ

'To lift the burdens under which humanity groans it will make them free from the shackles, which bind them'. Humanity will be made free from the chains of slavery tied so long on and this purpose in itself is great. But it is only the negative aspect. After shattering these shackles, and making humanity free from them, the Qur'an takes a positive step. For this purpose, the second aim of the Messenger of Allah (PBUH) is told as:

(62: 2) وَيُزَكِّيهِمْ

He (PBUH) works for the development of the personality of human beings. This responsibility was not restricted to the lifetime of the Messenger of Allah (PBUH). It had to move further, and it was the aim of the system that was established for the practical implementation of the Book of Allah. That is why it was said to the party of the people responsible for the establishment of this system:

(22:41) ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّـٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ

"These are the people who will establish System of ***Salaat*** when they have the control of the country and 'will give ***Zakaa".*** I have no time to explain this aspect of the program of the Islamic system of governance that has so comprehensively been given in this brief verse. I will deliberate upon one aspect that is related to the topic under discussion i.e., the broadening of the individuality, the development of personality. In our system ***Zakaat*** generally means "at the end of a year, giving some amount of money from one's wealth in the path of Allah". 'Giving some amount' is not the end product of the Qur'an. The Qur'anic exposition of this term is much more broad. It has been said here that the responsibility of the Islamic System is ***Eetta-e-Zakaat***, not "giving ***Zakaat***" or "receiving ***Zakaat***". The word ***Zakaat*** means: "to grow, to develop, to bloom and blossom". "***Eetta-e-Zakaat"*** means providing the means of development to individuals. It includes physical as well as personality development as far as the physical development of humans is concerned, it pertains to the Qur'an's system of economics. I have written quite extensively on this for the last 25 years. At this point of time I present the gist of this system through the saying of the Messenger of Allah (PBUH):

> **God's responsibility of protecting a community ceases, where even a single person goes to bed hungry,**

It was the same responsibility that the 2nd caliph Hazrat Omar (RA) repeated in his well-known words:

> **If a dog dies of hunger by the Tigris (river in Iraq), I swear by God with Whom rests my life, Omar will be held responsible for it.**

This very aspect of "***Eetaa-e-Zakaat***" is the obligation of the Islamic System that is related to satisfying the physical needs of individuals. As far as the development of the potentialities of the human personality is concerned, I may make it very clear that this is the ultimate end to be achieved by this system. The first article of this system is to create an atmosphere wherein is the state of

(2: 38) لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

'There is no fear and sorrow, no grief and anxiety, no agony and pain'. In other words the individuals of the society have neither any fear of external dangers, nor any grief and anxiety within their internal world. There is food for thought here. This aspect of the (Qur'anic) system provides a solid foundation for realizing the human potential. The system is obliged to carry out its responsibility, among others, of (in reference to the Messenger)

Another obligation of this system with reference to the Messenger of Allah (PBUH) is described in these words:

(62: 2) يُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ

He (PBUH) makes arrangements to educate them in such a way that they may be able to understand the **'why of law'** on one hand, and garnishes their intellect to enable them to grasp the depths of the mysteries of the universe on the other hand. He (pbuh) first says تُطَهِّرُهُمْ and then تُزَكِّيهِم (9:103). He (pbuh) not only nourishes the human potentialities, but also makes them able to utilize these developed potentialities in consonance with Divine Value. It inculcates purity of character and beauty in conduct. It is called sublimation process of character and conduct.

The Ultimate End

It should be clear from these illustrations that the Qur'anic view of (a) providing the Divine System of Guidance, (b) sending the Messengers (Peace Be Upon Them), (c) revealing the code of Divine Laws, (d) prescribing restrictions, and (d) keeping the final Book of God perfect, unchangeable, and protected -the logical consequence of which is the End of Messengerhood has **an end** to achieve. This **end** is the achievement of the following objectives:

- To make all human beings free from the shackles of slavery
- To develop the potentialities of humans
- To utilize these developed potentialities in consonance with Divine Values.

This process is denoted as purity of character. But further thinking in the Qur'an makes this reality clear that individual's growth and development is not the last stage of this process. Its next stage is to prepare a group of people, a nation whose **end** is the well being of human species. For such a kind of nation, it has been said that:

(3: 109) كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

'You are the integrated nation, equipped for the well being of the manhood. You are an ***Ummah*** raised for the good of all humanity'.

Judge the importance of this fact that the Qur'an has said of the individual:

(89: 29-30) فَٱدْخُلِى فِى عِبَـٰدِى ﴿٢٩﴾ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى

If an individual desires to have a paradisiacal life, one has to join hands with other like – minded people (89:29-30)

Paradise is not created by retreating to the seclusion of monasticism and mysticism; it requires a social set up. In other words, individuals are an integral part of the group of people or of ***Ummah*** and the responsibility of the group or ***Ummah*** is the welfare and wellbeing of the universal humanity. For the welfare of humanity, the Qur'an does not use the unambiguous terms like "interest of the State" or public interest. It clearly says

(13: 17) وَأَمَّا مَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى ٱلْأَرْضِ

'Always remember that which is beneficial for the humanity endures'; Everlastingness and permanence is only for the acts that are beneficial for mankind.

The Relation Between the Individual and the Party

I have presented the mutual relation between the individual and the State whatsoever I, with my own vision, have understood from the Qur'an. But we have a new terminology introduced in our times. It is Collectivism Theory. This theory is neither new, nor unique. It is, in fact, the changed name of Hegel's Theory of the State. According to this theory: interest of the State is the most important consideration. . It possesses an "organic" unity. Existence is only of society or party, and not of the individual. With this exposition of Collectivism Theory in view, there is no need to add any thing to what has been said of the State Theory. The Qur'an lays stress on collective life. And the antagonists of Collectivism Theory, presenting it in support of their theory, term it exactly in accordance with Islam. I thought it necessary to remove this confusion in a few words. Some of them have been heard saying that Iqbal, the great Muslim scholar, also held the same theory. It is ingeniousness of irony and undue criticism on Sir Mohammad Iqbal. Every one knows that Iqbal is a torchbearer of the philosophy of Self (I-am-ness). Self is another name of 'individuality'. The sum total of Iqbal's message is the development, preservation, and immortality of the individuality. He showers so much importance on the individuality of the human self that he does not allow this self to be absorbed in the Divine Self, let alone the State or the party s/he belongs to. He maintains its uniqueness. He wants to develop it so that it may emerge as an independent entity equipped with the facets of the Divine Self. He does not accept that it weakens, even at the cost of everlastingness of life. He says individuality cannot be strengthened in the solitude of mysticism; it develops and is strengthened while living in the company of people. That is why he lays stress on establishing link with the party, and not being absorbed in it; ***Ummah*** other than the individuals, to him, is nothing; it develops with the mutual link with each other. When these two synchronize with each other, it is called ***Ummah***. 'Individuals of the caravan' and the 'caravan' itself is the most appropriate simile in his poetry. The caravan other than the individuals has no existence. The individuals with their mutual sync constitute

it. But it is necessary that the individuals may remain with the caravan so that being in the state of protection, secure and safe from the dangers, they may reach the ultimate destiny. The Qur'an establishes this relation when it says:

(3: 199) يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱصْبِرُوا۟ وَصَابِرُوا۟ وَرَابِطُوا۟ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

O Jama'at-ul-Momineen, Allah's Laws have reached you. Now you be steadfast yourself and cause others also to be steadfast, stand united and adhere to Allah's Laws so that you may prosper.

This is the mutual relation of the individuals with the party. In other words, it means the mutual relation of the individuals among one another is the cause of their steadfastness and reinforcement. There is no annihilation of self like the one in mysticism where it is absorbed in water and ends its uniqueness. And nor is it the System of the State or the Collectivism Theory in which the State or Collectivism is the end and the individuals the means only. The life-giving message of the Qur'an roots out all these theories. It has comprehensively covered individuality in a few words so wonderfully. It says the collective life is so good and so fair but:

(6: 94) وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَٰدَىٰ

'You will confront Us as individuals with your individuality and will be called to account for your thought and conduct as individuals'. This is the focal point of the **Law of Requital**. The individuals try to achieve the prescribed ends of **Deen** in an organized way. This organized structure of theirs is termed as party or ***Ummah.*** Its objective is nothing but:

(9: 40) كَلِمَةُ ٱللَّهِ هِىَ ٱلْعُلْيَا

the defeat of man-made system and the triumph of Allah's system. The world has tried various systems of life and has failed to get consolation from any one of these systems. The Man is tired now and is in search of a system, he sees nowhere. But this system is in the process of being in his thoughts. Erich Fromm sees its glimpse like the manner given below:

> **A society in which no man is a means towards another's ends, but always and without exception an end in himself; hence, where nobody is used, nor uses himself, for purposes which are not those of the unfolding of his own human powers; when man is the center, and where all economic and political activities are subordinated to the aim of his growth. A sane society is one in which qualities like greed, exploitativeness, possessiveness, narcissism, has no chance to be used for greater material gain or for the enhancement of one's personal prestige. Where acting according to one's conscience is looked upon as a fundamental and necessary quality and where opportunism and lack of principles is deemed to be asocial; where the individual is concerned with social matters so that they become personal matters, where his relation to his fellow man is not separated from his relationship in the private sphere. A sane society, furthermore, is one which permits man to operate within manageable and observable dimensions, and to be an active and responsible participant in the life of society, as well as the master of his own life. It is one which furthers**

> **human solidarity and not only permits, but stimulates, its members to relate themselves to each other lovingly; a sane society furthers the productive activity of everybody in his work, stimulates the unfolding of reason and enables man to give expression to his inner needs in collective art and rituals. (241-42)**

This thinker calls this type of society as **The Sane Society**. And this is the very name of that book from which the above reference has been given. Very broadly and intensively the Qur'an describes the characteristics of this society. It covers its ultimate end in a few words when it says:

(17: 70) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ ءَادَمَ

'Verily We have honoured every human being'. And protecting this honour is the end product of the society. If society or the system does not honour the prestige of the individual, it is a corrupt and cursed society, and is the root cause for deterring the accomplishment of the purpose of the creation of mankind.

The System, the State, the Society that deprives people of the individuality of a person, honour of mankind and allows grief-stricken life to pass has curse of Allah, of His Divine Forces, and of the Universal humanity. How alarmingly the Qur'an depicts such a life in the following verse:

(3: 87) عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ ٱللَّهِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجْمَعِينَ

'These people are deprived of Allah's blessings as well as the support of the Divine Forces and the righteous persons'. In the course of ages, this idea slowly dawned on man and gradually crystallized that the world is not merely changing, but is developing towards perfection.

From the deliberations I have made about "State Or Individual", it necessarily follows that the individual, and his personality is **an end in itself**. No man has the right to exploit another man or to use him as a means in furthering his personal interests. If society were organized on this basis, there would be neither rulers nor subjects. This is the second principle on which society in Islam is based. No man is permitted to compel others to obey him; Allah alone is to be obeyed through the Laws He revealed in the Qur'an.

****

END